شکست
کے
بعد

شکست کے بعد

کرشن چندر

لاہور
انارکلی کتاب گھر

ستمبر ۱۹۵۱ء
قیمت چار روپے

لاہور آرٹ پریس انارکلی لاہور میں علاؤ الدین نے چھپوا کر شائع کی

فہرس

اُردو کا نیا قاعدہ

(بچّوں کے لئے)

اُن تمام رفیقوں کے نام
جو زندگی کے لئے ایک نیا قاعدہ
مرتب کر رہے ہیں ——— !

الف انسان، بچو! ہم سب انسان ہیں۔ جس طرح الف اس قاعدے کا پہلا حرف ہے۔ ہماری سماج کی اکائی! ہم تم سب انسان ہیں۔ انسانوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں، چھوٹے انسان اور بڑے انسان، چھوٹے انسان وہ ہوتے ہیں جو چکی چلاتے ہیں، کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ سوت کاتتے ہیں، کارخانوں میں کام کرتے ہیں، لڑائیاں لڑتے ہیں، ریل گاڑیاں چلاتے ہیں اور زمین کے اندر گھس کر کوئلہ، نمک، سونا، چاندی اور لوہا نکالتے ہیں۔ یہ سب چھوٹے انسان کہلاتے ہیں، دوسری قسم بڑے انسانوں کی ہے۔ بڑے انسان وہ ہوتے ہیں جو چھوٹے انسانوں کو انسان نہ سمجھیں۔

انسان کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ وہ اشرف المخلوقات ہے۔ سارے جانوروں میں اچھا جانور انسان ہے، اور سارے انسانوں میں سے اچھا انسان انگریز ہے۔ انگریز بھی الف سے شروع ہوتا ہے۔ اس لئے وہ بھی انسان ہے۔ گو بعض لوگ اُسے خدا سمجھتے ہیں۔

بچو! انگریز تم نے اکثر دیکھا ہوگا۔ انگریز کی چمڑی سفید ہوتی ہے۔ تمہارا رنگ کالا ہے۔ بھورا ہے۔ گندمی ہے۔ لیکن سفید نہیں ہے۔ سفید رنگ انگریز کا ہوتا ہے۔ اور انگریز ہندوستان پر حکومت کرتے ہیں۔ اور جب انگریز

ہندوستان پر حکومت نہیں کرتے تھے تو اس ملک کی حالت ابتر تھی۔ لیکن آجکل بالکل امن ہے۔

الف انسان، الف انگریز، الف امن، بچو امن بھی الف سے شروع ہوتا ہے، گو ہندوستان میں تو اُسی وقت سے شروع ہوا ہے۔ جب سے انگریز یہاں آئے ہیں۔ الف اتفاق بھی ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ ہندوستان میں نہیں ہوتا۔ سو اس قاعدے میں بھی اُس کا ذکر نہیں آئے گا۔ اس لئے بچو! موجودہ امن کے زمانے کو یاد رکھو اور کہو!

الف - انسان

ب بچے، بچو! تم سب بچے ہو۔ بچے وہ ہوتے ہیں جن کے ماں باپ ہوتے ہیں اور جو انہیں کاغذ، قلم، سلیٹ اور تختی دے کر سکول بھیجتے ہیں۔ لیکن کئی بچے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے ماں باپ نہیں ہوتے اور وہ سکول میں پڑھنے کے لئے نہیں آتے۔ لیکن ان بچوں کو ہم بچے نہیں کہتے یتیم کہتے ہیں۔ دوسرے ملکوں میں سو بچوں میں سے نوے بچے سکول میں پڑھتے ہیں۔ ہندوستان میں سو بچوں میں سے صرف دس بچے سکول میں پڑھتے ہیں، باقی آنگنا میں گلی کھیلتے ہیں۔ اس لئے انہیں یتیم کہتے ہیں۔

ہندوستان میں سب ملکوں سے زیادہ تعداد میں بچے پیدا ہوتے ہیں اور

مرتے بھی سب سے زیادہ تعداد میں ہیں لیکن جینا مرنا تو خدا کے اختیار میں ہے اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔ بچّے تو بھگوان اور اللہ بھیجتا ہے اور پھر وہی انہیں واپس بُلا لیتا ہے۔ یہی انجیل میں بھی لکھا ہے۔ اس لئے کہو

ب - بچہ

پ۔ پتلون، بچّو! پ سے پتلون ہوتی ہے، پ سے پائجامہ بھی ہوتا ہے جو تم اکثر پہنتے ہو۔ اور پ سے پنکھا بھی ہوتا ہے جو تمہارے گھروں میں اناج کے خوشوں اور گنّے کے چُوسے ہوئے چھلکوں سے بنایا جاتا ہے۔ لیکن یہ سب دیسی چیزیں ہیں اور کسی کام کی نہیں۔ ان سے تمہارے علم میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ اس لئے پ سے پتلون ہی صحیح ہے!

پتلون پڑھے لکھے لوگ پہنتے ہیں۔ اور جب تم بھی پڑھنا لکھنا سیکھ جاؤ گے تو پتلون پہنا کرو گے، پتلون پہننے سے جسم چست رہتا ہے۔ اور دماغ روشن ہوتا ہے۔ درزی ایک پتلون اتنے عرصے میں سیتا ہے۔ جتنے عرصے میں دس پاجامے تیار ہوتے ہیں۔ پتلون بڑی مشکل سے تیار ہوتی ہے۔ لیکن کیا کیا جائے پتلون کے بغیر پڑھنا لکھنا بھی تو بڑا مشکل ہے۔ اس لئے بچّو اگر تم پڑھنے لکھنے کو رکھتے ہو عزیز۔ تو ہر دم پتلون پہنے سبق یاد کرو۔ کہ جو آدمی پتلون نہیں پہنتا وہ

جاہل ہے۔

آدمی پتلون پہنتا ہے اور پتلون پیٹی پہنتی ہے جو اکثر حالتوں میں آدمی کے کندھے تک جاتی ہے۔ پیٹی، پتلون، پہننا، پڑھنا یہ تمام الفاظ پے سے شروع ہوتے ہیں۔ اس لئے کہو۔

پ - پتلون

تے تالی، بچو، تالی دونوں سے بجتی ہے، لیکن جس بچے کا ایک ہی ہات ہو وہ اُسے ران پر ہاتھ مار کر بھی تالی بجا سکتا ہے۔ اور ہپ ہپ ہُرّے کا شور مچا سکتا ہے۔

تالی اس وقت بجتی ہے جب کلکٹر صاحب سکول کے سالانہ جلسے پر انعام تقسیم کرنے کے لئے آتے ہیں، یا جب تعلقدار صاحب سکول کو چندہ دیتے ہیں۔ اس لئے کہو

ت - تالی

ٹے ٹامی، بچو ٹامی عام طور پر انگریز سپاہی کو کہتے ہیں۔ یہ سپاہی ولایت سے آتا ہے اور کچھ عرصہ ہندوستان میں رہ کر پھر ولایت لوٹ جاتا ہے۔ سپاہی تو ہندوستانی بھی ہوتے ہیں لیکن وہ ٹامی نہیں ہوتے۔ ٹامی اور

ہندوستانی سپاہی میں یہ فرق ہے کہ ہندوستانی سپاہی کالے رنگ کا ہوتا ہے اور ٹامی سفید رنگ کا۔ ٹامی کو تقریباً پچھتر روپے تنخواہ ملتی ہے اور ہندوستانی سپاہی کو تقریباً تیس روپے۔ ٹامی کی زندگی کی ضروریات بہت بڑھی ہوئی ہیں، اور ہندوستان کی بہت کم، ہندوستانی بھی اپنی زندگی کی ضروریات بڑھا سکتا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس سے اُس کی تنخواہ بھی بڑھ جائے سالئے جو ملے اس پر قناعت کرو اور کھو

ٹ - ٹامی

ث ثواب، بچو! ثواب اس کام کو کہتے ہیں، جو آدمی خود کرتا ہے لیکن جس سے فائدہ دوسرے کو پہنچتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر تم اپنے گھر سے میرے لئے آٹا چاول، نون تیل لاتے ہو تو تم ثواب کرتے ہو اور فائدہ مجھے ہوتا ہے۔ اور پھر میں ایک غریب مدرس ہوں، مجھے صرف پندرہ روپے تنخواہ ملتی ہے اور ان پندرہ روپوں میں میرا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اگر تم چاہتے ہو کہ میں زندہ رہوں اور تمہیں ثواب حاصل ہو تو میرے لئے ہمیشہ ہمیشہ آٹا، چاول، نون، تیل اور لکڑی لاتے رہا کرو۔ ثواب بڑی اچھی چیز ہے

اور انگریز ہمیشہ سے ہندوستان پر ثواب کرتے آئے ہیں۔ اس لئے کہو۔

ث - ثواب

جیم جنگ، بچو! جنگ وہ ہے جو آجکل ہو رہی ہے، جنگ ہمیشہ ہوتی ہے اور جب نہیں ہوتی تو اُسے صلح یا امن کا زمانہ کہتے ہیں، امن کے زمانے میں لوگ جنگ کی تیاریاں کرتے ہیں اور جنگ کے زمانے میں امن کے خواب دیکھتے ہیں، اس عمل کو سیاست کہا جاتا ہے۔

پہلے جنگ اکا دکا آدمیوں کے درمیان ہوتی تھی۔ پھر قبیلوں کے درمیان بڑھنے لگی، پھر بادشاہوں کے درمیان ہونے لگی۔ اب جنگ ملکوں اور قوموں کے درمیان لڑی جاتی ہے۔ لیکن نتیجہ ہر حالت میں وہی ہوتا ہے، یعنی لوگ مرتے ہیں، عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہوتے ہیں، خون کی ندیاں بہتی ہیں اور آخر میں انصاف کی فتح ہوتی ہے۔ جب سے دنیا میں جنگ شروع ہوئی ہے ہمیشہ سچائی اور انصاف کی فتح ہوتی چلی آئی ہے۔ آخر میں ہمیشہ سچائی اور انصاف کی فتح ہوتی ہے۔ پچھلی جنگ میں بھی انصاف کی فتح ہوئی تھی۔ اس جنگ میں بھی انصاف کی فتح ہوگی۔ اس سے اگلی جنگ میں بھی انصاف کی فتح ہوگی۔ حتےٰ کہ ایک دن اس دنیا میں ایک آدمی بھی باقی نہ رہے گا۔ صرف انصاف ہی انصاف رہ جائے گا اور یہی جنگ کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اس لئے کہو

ج - جنگ

چ چور، بچو! چور وہ ہوتا ہے جو تمہاری چیز چوری کر کے لے جائے جس طرح چوہے طاق پر سے تمہاری مٹھائی چُرا کر لے جاتے ہیں، لیکن چور صرف چوہے نہیں ہوتے، انسان بھی چور ہوتے ہیں، چوہے یا انسان اس لئے چوری کرتے ہیں کہ ان کے پاس وہ چیز نہیں ہوتی جس کی وہ چوری کرتے ہیں اور جو دوسروں کے پاس ہوتی ہے، مثال کے طور پر اگر چوہوں کے پاس مٹھائی ہو تو کیا وہ تمہاری مٹھائی چرائیں گے؟ ہرگز نہیں! یہی حال انسانوں کا ہے، وہ بھی ایک طرح کے چوہے ہیں اور وہی چیز چراتے ہیں جو ان کے پاس نہیں ہوتی۔ وہ چوری کرتے ہیں جب وہ بھوکے ہوتے ہیں، ننگے ہوتے ہیں، غریب ہوتے ہیں، چوروں سے ہمیشہ بچنا چاہیئے۔ چوہوں سے بھی بچنا چاہیئے کیونکہ اُن سے پلیگ پھیلتی ہے۔ چوہوں کو بلی کھاتی ہے، اور چوروں کو حکومت، لیکن کبھی کبھی حکومت خود چور بن جاتی ہے اور لوگوں کی چیزیں چُرا لیتی ہے، ایسی حالت میں ملک کی ساری دولت سب میں برابر تقسیم کر دینا چاہیے۔ تاکہ کوئی کچھ چرا ہی نہ سکے۔ نہ حکومت رہے نہ چور، کیونکہ جہاں چوہے ہوتے ہیں وہاں بلی بھی ہوتی ہے، اور جہاں چور ہوتے ہیں وہاں حکومت بھی ہوتی ہے۔ اس لئے کہو

چ - چور

ح حکومت، بچو! حکومت اس کو کہتے ہیں جو تھوڑے سے

انسان بہت سے انسانوں پر روا رکھتے ہیں، تم بہت سے بچّے ہو لیکن تم سب میرے تابع ہو۔ اس سکول میں میری حکومت ہے۔ میں اس تحصیل میں رہتا ہوں۔ اس تحصیل میں اور بھی بہت سے آدمی رہتے ہیں لیکن اس تحصیل پر صرف ایک تحصیل دار کی حکومت ہے، یہ تحصیل ایک ضلع میں ہے، جہاں کلکٹر کی حکومت ہے، یہ ضلع ایک صوبے میں ہے جہاں گورنر کی حکومت ہے، صوبہ ایک ملک میں ہے۔ جہاں بادشاہ کی حکومت ہے۔ ملک زمین پر ہے جہاں خدا کی حکومت ہے، خدا دنیا میں ہے جہاں پیسے کی حکومت ہے!

حکومت کے بغیر آدمی سانس بھی نہیں لے سکتا۔ اگر یہ حکومت نہ ہوتی تو یہ اسکول بھی نہ ہوتا اور نہ تم مجھ سے سبق لیتے نہ میں تمہیں پڑھاتا۔ یہ بھی حکومت کی برکت ہے۔ اس لئے بچو ہمیشہ حکومت کی عزت کرو۔ اور یاد رکھو کہ ہر شخص حکومت نہیں کر سکتا اور ہندوستانی تو خاص طور پر کبھی حکومت نہیں کر سکتے۔

جو لوگ حکومت کرتے ہیں وہ حاکم کہلاتے ہیں اور جن پر حکومت کی جاتی ہے انہیں محکوم یعنی رعایا کہتے ہیں۔ حاکم ہمیشہ رعایا کے فائدے کے لئے حکومت کرتا ہے، اسی لئے حاکم ہمیشہ امیر ہوتا ہے اور رعایا ہمیشہ غریب ہوتی ہے، یہ اس لئے کہ حاکم ہمیشہ رعایا کے فائدے کے لئے حکومت کرتا ہے۔ اگر خدانخواستہ کبھی ایسا ہو جائے کہ حاکم رعایا کے فائدے کے لئے نہیں اس کے نقصان کے لئے حکومت کرے تو رعایا امیر اور حاکم غریب ہو جائے گا۔

اور یہ اچھی بات نہ ہوگی۔کیونکہ غریب حاکم کبھی حکومت نہیں کر سکتا۔اس لئے حاکم کو ہمیشہ رعایا کے فائدے کے لئے ہی حکومت کرنا پڑتی ہے۔بعض لوگ چاہتے ہیں کہ حکومت کا وجود ہی دُنیا سے مٹا دیا جائے۔ ایسے لوگ بہت بُرے ہوتے ہیں۔ وہ تو گویا "ح" کے لفظ ہی کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔بچو اب تم ہی بتاؤ کہ اگر لفظ "ح" کو مٹا دیا جائے تو تم "حاکم" کیسے بن سکو گے اور "حکومت" کیسے کرو گے؟ اس لئے ان پاگل آدمیوں کی باتیں کبھی نہ سنو اور کہو:

ح ۔حکومت

خ خربوزہ، بچو! تم نے اکثر خربوزہ کھایا ہوگا۔خربوزہ ہندوستان کا مشہور میوہ ہے۔ ہندوستان کا ایک اور مشہور میوہ بھی ہے۔اُسے پھُوٹ یعنی نفاق بالفاظِ دیگر ہندو مسلمان کی لڑائی کہتے ہیں۔ہندوستان کے میوے بہت مشہور ہیں۔ اور وہ دور دور تک وساور کو جاتے ہیں۔لیکن پھُوٹ کا میوہ باہر نہیں جاتا۔انگریز اسے بالکل نہیں کھاتے۔ انگریز خربوزہ بھی نہیں کھاتے۔کیونکہ اس سے ہیضہ پھیلنے کا ڈر ہوتا ہے۔ ہندوستان کی ہر شے سے ہیضہ پھیل سکتا ہے، خربوزے سے، ترکاری سے، دودھ سے، پانی سے، ہوا سے، مٹی سے، اس ملک کے ذرّے ذرّے میں ہیضہ چھپا ہوا ہے۔ اس لئے خربوزہ کبھی نہ کھانا چاہیئے۔

خربوزہ باہر سے بڑا خوبصورت اور خوشبودار ہوتا ہے، لیکن اندر سے بالکل پھیکا اور بیجوں سے بھرا ہوتا ہے۔ بعض آدمی بھی خربوزے کی طرح ہوتے ہیں لیکن ہم انہیں خربوزہ نہیں کہتے، بڑے آدمی کہتے ہیں۔ دنیا کے ہر ملک میں بڑے آدمی ہوتے ہیں۔ لیکن جتنے خربوزے ہندوستان میں ہوتے ہیں اور کہیں نہیں ہوتے۔ خربوزے میں ایک اور وصف بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب چھری خربوزے پر گرتی ہے تو خربوزہ کٹتا ہے اور جب خربوزہ چھری پر گرتا ہے تو بھی خربوزہ کٹتا ہے لیکن یہ وصف بڑے آدمیوں میں نہیں پایا جاتا وہ خود کبھی نہیں کٹتے، ہمیشہ دوسروں کو کٹواتے ہیں۔ اس لئے کہو۔

خ - خربوزہ

دال دام، بچو دام سے ہر چیز خریدی جا سکتی ہے، تم نے یہ قاعدہ دام دے کر حاصل کیا ہے، یہ تختی، یہ قلم، دوات، کاغذ، پنسل، سلیٹ، ہر چیز دام دے کر حاصل کی ہے، دام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے۔ کہ اس سے آدمی پتھر کی مورتی سے لے کر پتھر کی پنسل تک خرید سکتا ہے، اور خدا سے لے کر خدمتگار تک حاصل کر سکتا ہے، دام دنیا کا بادشاہ ہے پہلے پہل دنیا میں دام نہیں تھے سب لوگ بے دام تھے بلکہ یوں کہو کہ "بودم" تھے۔ پہلے یہ ہوتا تھا۔ کہ اگر میرے پاس چمڑا ہے اور مجھے گیہوں چاہیئے۔ اور تمہارے پاس گیہوں ہے، اور تمہیں چمڑا چاہیے۔ تو تم مجھ سے چمڑا لے لیتے تھے۔ اور مجھے گیہوں دے

دیتے تھے اور خوشی خوشی گھر چلے جاتے تھے۔ اب یہ صورت ہے کہ نہ میں تمہیں دام کے بنا چمڑا دیتا ہوں۔ نہ تم دام کے بنا مجھے گیہوں دیتے ہو اور نہ ہم لوگ خوشی خوشی گھر جا سکتے ہیں۔ کیونکہ آجکل گھر بھی دام کے بنا نہیں ملتے اس صورتِ حال کو لوگ "انسانی ترقّی" کے نام سے پکارتے ہیں۔ کئی لوگ کہتے ہیں کہ خوشی کا دام سے کوئی تعلّق نہیں لیکن میں نے کسی بندۂ دام کو یہ کہتے نہیں سنا کہ دام کے بغیر دنیا میں خوش رہنا محال ہے۔ پہلے یہ ہوتا کہ لوگ میرے علم و فن کو دیکھتے تھے اور اس کے بدلے مجھے پندرہ روپے نہیں دیتے تھے بلکہ میری زندگی کی ساری ضروریات پوری کر دیتے تھے۔ اب کسی نے دام دینے کا یہ نیا طریقہ نکالا ہے اور ساری دنیا کی خوشی کو اپنے قبضے میں کر لیا ہے۔ اس سے تو شاید پہلا طریقہ ہی بہتر تھا۔ اس میں خوشی زیادہ تھی۔ آجکل دام بہت دکھائی دیتے ہیں۔ خوشی کم ہے۔

پہلے دام کوڑیوں کے ہوتے تھے، انہیں دام نہیں بلکہ چھدام کہتے تھے پھر دام دھاتوں سے بنائے جانے لگے۔ تانبا، چاندی، سونا، پیتل، لوہا، ان سب دھاتوں سے دام تیار کئے گئے، آج کل دام کاغذ کے بنتے ہیں۔ دام جال کو بھی کہتے تھے۔ دراصل اس دام اور اس دام میں بہت فرق ہے یہ بھی ایک طرح کا جال ہے، جس میں انسانوں کی خوشی قید کر دی گئی ہے بچّو! ہم سب اسی جال میں گرفتار ہیں۔ اس لئے کہو۔

دال - دام

ڈال - ڈاکو، بچو! ڈاکو چور کا بڑا بھائی ہوتا ہے اور بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ تم نے اکثر دیکھا ہو گا کہ کس طرح تمہارا بڑا بھائی تم سے زبردستی کھلونا چھین کر چلا جاتا ہے اور تم روتے رہ جاتے ہو، اور رونے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے کیونکہ تمہارا بڑا بھائی تم سے زیادہ طاقتور ہے۔ وہ بڑا ہے۔ اور تم چھوٹے ہو۔ یہی حال ڈاکو کا ہے! وہ بھی اپنے سے چھوٹے اور کمزور آدمی پر ہاتھ ڈالتا ہے، اور اس سے سب کچھ چھین لیتا ہے۔ جب ایک انسان ایسا کرتا ہے تو ہم اُسے ڈاکو کہتے ہیں۔ جب دو انسان ایسا کرتے ہیں تو ہم اُسے قبیلہ کہتے ہیں، جب تین انسان ایسا کرتے ہیں تو ہم اسے جاگیرداری کہتے ہیں اور جب چار انسان ایسا کرتے ہیں تو وہ شاہیت کہلاتی ہے، نام مختلف ہیں لیکن اصول وہی ہے۔ اور پھر اس میں مزا یہ ہے کہ جب ایک انسان ڈاکہ ڈالتا ہے تو ہم اسے پھانسی کی سزا دیتے ہیں، لیکن جب چار آدمی مل کر یہ کام کرتے ہیں تو انہیں خطاب دیئے جاتے ہیں، قوم انہیں اپنا ہیرو سمجھتی ہے اور پوجتی ہے اور سینکڑوں برس تک ان کا نام رہتا ہے، اُن کے بیٹوں کو جاگیریں دی جاتی ہیں اور وہ لوگ بادشاہ اور شہنشاہ بنا دیئے جاتے ہیں اور اُن کا درجہ خدا کے بعد سمجھا جاتا ہے! توبہ توبہ۔ زمانے کو کیسی ہوا لگ گئی ہے۔ بچو! ان ڈاکوؤں سے ہمیشہ بچو، اور دنیا کی طاقت کو انسانوں میں برابر بانٹ دو۔ تاکہ کوئی زبردست نہ رہے، کوئی زبردست نہ رہے۔ اور جب تک ایسا نہیں ہوتا۔ نیا قاعدہ پڑھتے جاؤ اور کہو۔

ڈ - ڈاکو

شکست کے بعد

ذال، ذخیرہ، بچّو! جب بہت سی چیزیں ایک جگہ جمع ہو جائیں تو اُسے ذخیرہ کہتے ہیں، جنگل بھی ایک قسم کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ درختوں کا سکول بھی ایک قسم کا ذخیرہ ہوتا ہے، بچوں کا، پرانے زمانے میں حکومت کی طرف سے ہر گاؤں میں اناج کا ذخیرہ رکھا جاتا تھا۔ تاکہ قحط سالی کے دنوں میں لوگوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو، مغل بادشاہوں کے وقت میں بھی اناج کے بڑے بڑے ذخیرے رکھے جاتے تھے جن میں ہر سال نیا اناج بھرا جاتا تھا۔ آج کل بھی حکومت ذخیرے قائم کرتی ہے، لیکن ان میں اناج نہیں بھرا جاتا۔ ان میں روپے اور نوٹ بھرے رہتے ہیں۔ ان ذخیروں کو لوگ باگ بینک کے نام سے پکارتے ہیں۔ قحط سالی کے دنوں میں یہ ذخیرے اناج کے بجائے روپے اور نوٹ تقسیم کرتے ہیں۔ روپیہ چاندی کا ہوتا ہے۔ نوٹ کاغذ کا ہوتا ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں کھانے کے حق میں اچھی نہیں۔ ابھی حال میں بنگال میں قحط پڑا تھا۔ اور لاکھوں آدمی مر گئے، اس کی وجہ یہ تھی کہ مہاجنوں اور دوسرے امیر آدمیوں نے اناج چھپا لیا تھا۔ اگر اس وقت حکومت کے اپنے اناج کے ذخیرے ہوتے تو وہ فوراً اناج نکال نکال کر لوگوں میں بانٹ دیتی۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ شاید اب لوگوں کو عقل آ جائے اور گاؤں میں اناج کے ذخیرے قائم ہو جائیں۔

انگلستان ایک جزیرہ ہے لیکن ہندوستان ایک ذخیرہ ہے بلبلوں کا

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا   ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

ہندوستان میں چالیس کروڑ بلبلیں رہتی ہیں ایسی کمینی، روتی بسورتی، فاقے کرتی ہوئی بلبلیں دنیا کے کسی اور حصے میں موجود نہیں، صرف ہندوستان ہی ان بلبلوں کا

ذخیرہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ غلامی، جہالت، پستی اور بےبسی کا بھی! اس لئے کہو

ذ۔ ذخیرہ

د۔ راجہ بچّو! تم نے راجہ دیکھا ہوگا۔ اگر راجہ نہیں تو راجہ صاحب کا ہاتھی ضرور دیکھا ہوگا۔ ہمیشہ یاد رکھو کہ راجہ صاحب کا ہاتھی ہوتا ہے، پنڈت جی کی بہلی ہوتی ہے، مولوی صاحب کا گھوڑا ہوتا ہے، غریب کا گدھا ہوتا ہے، دھوبی کا کتّا ہوتا ہے اور اکثر نہ گھر کا ہوتا ہے، نہ گھاٹ کا ہوتا ہے۔ لیکن راجہ صاحب کے پاس صرف ہاتھی ہی نہیں ہوتا اور سب کچھ ہوتا ہے۔ گھر، گھاٹ، دھوبی، کتّا، پنڈت، مولوی، ہاتھی، چیتا، بہلی، گاڑی، موٹر، کلغی، ہیرا سب کچھ ہوتا ہے، راجہ صاحب کی رانی بھی ہوتی ہے، بلکہ عام طور پر بہت سی رانیاں ہوتی ہیں جو عالیشان محلوں میں رہتی ہیں اور جو رانیاں نہیں ہوتیں، وہ پھونس کے جھونپڑوں میں رہتی ہیں۔ راجہ کے پاس رعایا بھی ہوتی ہے۔ اور رعایا کے بغیر کوئی راجہ راجہ نہیں کہلا سکتا۔

اس دنیا میں شروع سے یہی قاعدہ ہے کہ راجہ محل میں رہتا ہے، رعایا جھونپڑے میں رہتی ہے۔ راجہ تخت پر بیٹھ کر حکومت کرتا ہے، رعایا ہل چلاتی ہے، راجہ شراب پیتا ہے۔ رعایا پانی پیتی ہے اور پانی پی پی کر بھی نہیں کوستی اور جب پانی بھی نہیں ملتا تو چپ چاپ بھوکی پیاسی مر جاتی ہے۔ ایسے موقعے کو قحط سالی کہتے ہیں لیکن یہ دنیا کا پرانا قاعدہ ہے، نیا قاعدہ جو اب تم پڑھ رہے ہو یہ نہیں سکھاتا۔ نئے قاعدے میں راجہ اور پرجا سب برابر ہیں۔ کروڑوں روپیہ ایک محل پر صرف کرنے کے بجائے رعایا کے رہنے کے لیے ہزاروں اچھے گھر بنائے جاتے ہیں۔ چند موٹر اور ہاتھی رکھنے کے بجائے سرکاری کارخانے جاری کئے جاتے ہیں۔ اور کلغی تو بالکل اڑا دی جاتی ہے۔ بھلا سر پر کلغی لگانے سے کس کا پیٹ بھرتا ہے۔ نئے قاعدے میں کلغی لگانے اور ہیرے موتی کے زیور

شکست کے بعد

پہلنے پر کتابیں پڑھنے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس لئے نیا قاعدہ پڑھو اور کہو۔

ر۔ راجہ

ڑ۔ بچو! "ڑ" میں بڑی گڑبڑ ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے۔ کہ بڑی گڑبڑ میں "ڑ" ہے ڑ دراصل پہلے کبھی نہیں ہمیشہ لفظوں کے بیچ میں آتی ہے۔ جیسے "گڑبڑ" میں، لیکن ڑ بیچ میں آکر بھی سب پر چھا جاتی ہے۔ جیسے گڑبڑ میں۔ اب اس لفظ کو بولو تو معلوم ہوتا ہے گویا اس لفظ میں ڑ کی آواز کے سوا اور کوئی ہے ہی نہیں۔ یہ بیچ کے لفظ بہت برُے ہوتے ہیں اور بڑی گڑبڑ پیدا کرتے ہیں۔ اس قسم کی بیچ کی چیزوں کو ہم ایجنٹ اور دلاّل بھی کہتے ہیں۔ ہماری زندگی پر آجکل دلاّلوں کا قبضہ ہے۔ اور یہ لوگ زندگی کی ساری خوبصورت اور مفید اشیا پہ قبضہ کئے بیٹھے ہیں اور سب سے زیادہ منافع حاصل کرتے ہیں۔ یہ لوگ تجارت، حکومت، صنعت و حرفت، ہر شعبے کے بیچ میں آن گھسے ہیں اور بڑی گڑبڑ پیدا کر رہے ہیں۔ دراصل یہ بیچ کا طبقہ ہمیشہ بڑی گڑبڑ پیدا کرتا ہے۔ کبھی تو یہ امیروں کے ساتھ مل جاتا ہے۔ اور کبھی بظاہر غریبوں کا دم بھرنے لگتا ہے۔ لیکن کچھ بھی ہو۔ یہ طبقہ ہر حالت میں اپنا نفع حاصل کرنے کی فکر کرتا ہے۔ گویا یہ درمیانہ طبقہ ہماری سماج میں چمگادڑ کی طرح ہے اور چمگادڑ میں بھی ڑ آتی ہے۔ دراصل یہ "ڑ" بڑی خطرناک آواز ہے۔ اس لئے جہاں تک ہو سکے اس سے بچو اور کہو

ڑ۔ گڑبڑ یعنی چمگادڑ

ز سے، زمین، بچو! تم اس وقت زمین پر بیٹھے ہو۔ لیکن اگر تم اس وقت ہوائی جہاز میں ہوتے تو میں کہتا کہ تم ہوا میں اُڑ رہے ہو، خیر۔ بچو یاد رکھو، زمین بڑے کام کی شے ہے۔ زمین سے اناج پیدا ہوتا ہے۔ تاکہ کاشتکار لگان ادا کر سکیں۔ زمین سے سونا نکلتا ہے۔ تاکہ دام والے حکومت کر سکیں۔ زمین سے لوہا نکلتا ہے تاکہ جنگ کے لئے توپیں اور بندوقیں بن سکیں۔ اور سب سے بڑھ کر زمین کا فائدہ یہ ہے کہ زمین گول ہے، اوپر، نیچے دائیں بائیں، ہر طرف سے گول ہے۔ جدھر سے دیکھو گول ہے۔ اور اگر نہ بھی دیکھو تو بھی گول ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا میں فساد کی جڑ "ڑ" نہیں "ز" ہے (جڑ میں بھی ڑ ہے) چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ زر، زن، زمین، ان تینوں میں "ز" ہے۔ اور ان تینوں کی وجہ ہی سے دنیا میں لڑائی ہوتی ہے اور فساد پھیلتا ہے مجھے اُن لوگوں سے اس لئے اتفاق نہیں کہ زر، زمین، زن، ان تینوں میں سے کوئی چیز بذاتِ خود بُری نہیں۔ بُری تو وہ گڑبڑ ہے جو ایک عرصے سے انسان کے دماغ میں پیدا ہو چکی ہے۔ "نفع" اگر یہ گڑبڑ دور ہو جائے، تو دنیا میں چاروں طرف خوبصورتی ہی خوبصورتی ہو جائے۔ اور یہ خوبصورت زمین خوشی سے ناچتے ناچتے اور بھی گول ہو جائے۔ بلکہ بالکل گول مول ہو جائے۔ اس لئے کہو۔

ز - زمین

ژ سے ژال۔ بچو! ژال نام پہلوان کا ہے۔ لیکن ہندوستان کے سب سے بڑے پہلوان کا نام ژال نہیں۔ گاما ہے۔ اُسے رستمِ زماں بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اُس نے دنیا کے تمام پہلوانوں کو کشتی میں پچھاڑ دیا ہے۔ رستم ایران کا ایک مشہور پہلوان تھا۔ لیکن رستم کا نام بھی رستم ہی تھا۔ ژال نہ تھا پھر بھی ژال نام پہلوان کا ہے۔

ژال یعنی پہلوان کا سر ہمیشہ گھٹا ہوتا ہے۔ کیونکہ پہلوانوں کو بھی پنڈتوں اور مولویوں کی طرح سر منڈانے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ سر منڈاتے ہی اولے پڑتے ہیں اور اولے کو فارسی میں ژالہ بھی کہتے ہیں۔ جو لفظِ ژال سے بنایا گیا ہے کیونکہ پہلوانوں کو سر منڈاتے ہی اولے پڑتے ہیں۔ یعنی ژالہ باری شروع ہو جاتی ہے۔ اس لئے بچو! اگر تم بھی پہلوان بننا چاہتے ہو تو سر منڈاؤ اور کہو۔

ژ۔ ژال نام پہلوان

سین سچائی۔ بچو! سچائی دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ تم نے جارج واشنگٹن کی کہانی ضرور سنی ہو گی۔ جس نے اپنے بچپن کے دنوں میں کلہاڑی سے اپنے باغ کا ایک درخت ڈالا تھا۔ اور جب اُس کے باپ

نے اُس سے ڈانٹ کر پوچھا۔ کہ یہ درخت کس نے کاٹا ہے۔ تو اس نے سچ بول کر اقرار کر لیا۔ "ہاں یہ درخت میں نے کاٹا ہے ابا جی۔" کہتے ہیں جارج واشنگٹن کے سچ بولنے پر اُس کا باپ بہت مرعوب ہُوا اور اُس نے پیشین گوئی کی کہ جارج بڑا ہو کر ضرور بڑا آدمی بنے گا۔ چنانچہ یہی ہُوا۔ اور جارج واشنگٹن بولتے بولتے ایک دن امریکہ کا صدر بن گیا۔ جارج واشنگٹن کے واقعے کے بعد دنیا کے ہر بڑے آدمی نے یہ وطیرہ اختیار کر لیا ہے۔ کہ وہ بچپن ہی سے سچ بولنا اور درخت کاٹنا شروع کرتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ قیصر ولیم کو درخت کاٹنے میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ مصیبت یہ تھی کہ اُسے ڈانٹنے والا کوئی نہ تھا۔ اس لئے قیصر ولیم کو کبھی سچ بولنے کا موقعہ نہ ملا اور وہ پچھلی جنگِ عظیم ہار گیا۔ اور سنا ہے کہ انگلینڈ کے وزیرِ اعظم مسٹر چرچل بھی سچ بولنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ انہوں نے اپنے بچپن میں اتنے درخت کاٹے ہیں۔ کہ کئی جنگل کے جنگل اجاڑ دیئے ہیں۔ اس طرح یورپ کے ایک بہت بڑے آدمی کی بابت مشہور ہے کہ اس نے سچ بولنے کی خاطر درخت کے علاوہ ایک آدمی کا گلا بھی کاٹ ڈالا تھا۔ اور اس کے باپ نے خوش ہو کر اُسے فوراً معاف کر دیا تھا۔

میں نے یہ قصّے تیسری جماعت میں پڑھے تھے، اُن دنوں مجھے

بھی سچ بولنے کا شوق چرایا۔ چنانچہ ایک دن موقعہ پا کر میں نے کلہاڑا ہات میں لیا اور اپنے گھر کے ارد گرد جتنے درخت تھے سب کاٹ ڈالے، گلاب کی جھاڑیاں، انگور کی بیلیں، پھولوں کی روشیں سب ویران کر ڈالیں۔ حالت یہ ہو گئی کہ شام کو جب والد دفتر سے لوٹے تو اپنا گھر بھی نہ پہچان سکے۔ میں نے انہیں حیران و پریشان دیکھ کر تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "آئیے آئیے پریشان کیوں ہوتے ہیں آپ۔ یہ آپ ہی کا گھر ہے۔" اس پر بھی میرے والد منہ سے کچھ نہ بولے۔ مڑ مڑ باغیچے کی طرف دیکھتے رہے۔ میں نے کہا۔ "آپ اس طرح گھور گھور کر کیا دیکھ رہے ہیں۔ ابّا سچ بات تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ میں نے کیا ہے۔ وہ —— جارج واشنگٹن والا قصّہ" —— لیکن اس کے بعد والد نے مجھے بولنے نہیں دیا۔ اور ایک کٹے ہوئے درخت کا تنا اُٹھا کر میری جو مرمّت کی ہے تو —— خیر میں جارج واشنگٹن نہ بنا۔ سکول ماسٹر تو بن ہی گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس دن سے میری داہنی ٹانگ لنگڑی ہو گئی۔ اور بائیں بازو کی ایک ہڈّی ٹوٹ گئی۔۔۔۔

—— تو بچّو! کہنے کا مطلب یہ ہے کہ چاہے ٹانگ لنگڑی ہو جائے چاہے بازو ٹوٹ جائے، چاہے جان چلی جائے، لیکن سچائی کو رکھو ہمیشہ عزیز۔ ہمیشہ سچ بولو۔ بلکہ پہلے بات کو تولو، پھر منہ کھولو۔ پھر سچ بولو اور کہو۔

س۔ سچائی

شین شراب، بچو! تم نے اکثر اپنے باپ کو آدھی رات کے وقت گھر کا دروازہ ٹٹولتے، جھومتے، گاتے، گالیاں بکتے سنا ہوگا۔ یہ شراب کا اثر ہوتا ہے۔ شراب بڑی اچھی چیز ہے۔ کیونکہ یہ انگور کے رس سے تیار کی جاتی ہے۔ لیکن آج کل انگور کی بیلیں کہیں دکھائی نہیں دیتیں۔ کیونکہ انہیں تمام بچوں نے کاٹ ڈالا ہے۔ جو جارج واشنگٹن کی طرح ہر وقت کاندھے پر کلہاڑا لئے پھرتے ہیں۔ اس لئے آجکل شراب انگور کے رس سے نہیں بلکہ جَو یا چانول، یا مکّی یا کیڑے مکوڑوں کے رس سے تیار کی جاتی ہے، جو چیز جتنی زیادہ گلی سڑی بسی ہوگی، اُس سے شراب اتنی ہی عمدہ تیار ہوگی۔ یہ شراب کا پہلا اصول ہے، شراب کا آخری اصول بیوی بچوں کو مارنے پیٹنے اور انہیں گالیاں دینے پر منتج ہوتا ہے۔ جب شراب تیار ہو جاتی ہے تو اُس میں تھوڑی کونین بھی ڈال دیتے ہیں۔ تاکہ ملیریا کے وہ مچھر جو شراب کے گلنے سڑنے کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں مر جائیں۔ اسی لئے تو شراب کا ذائقہ تلخ ہوتا ہے اور شرابی کو کبھی ملیریا نہیں ہوتا۔ لیکن ہندوستان میں لوگ شراب بہت کم پیتے ہیں۔ اسی لئے یہاں ہر سال لاکھوں موتیں ملیریا سے ہو جاتی ہیں۔ اس لئے بچو! اگر تم ملیریا سے بچنا چاہتے ہو اور شاعری کرنا چاہتے ہو۔ تو ہمیشہ شراب پیو۔ کیونکہ شاعری صرف شراب پینے سے آتی

ہے۔ شراب پینے سے آدمی کا حوصلہ بہت بڑھ جاتا ہے۔ دلیری، مردانگی، قوتِ عمل پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ آج کل ہندوستان کے شرابیوں کے حوصلے اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ انہوں نے اپنے ملک کو آزاد کرا لیا ہے اور اپنی حکومت قائم کر لی ہے۔ بچو تم بھی اس شرابستان کا ساتھ دو اور کہو۔

ش - شراب

صاد، صلح، بچو! صلح دو جنگوں کے بیچ میں آتی ہے۔ پہلے جنگ ہوتی ہے۔ پھر صلح ہوتی ہے۔ اور اگر جنگ نہیں ہوتی تو جنگ کی تیاری ہوتی ہے۔ آج کل بھی جنگ ہو رہی ہے، اس کے بعد جب ہمارے دشمنوں کو شکستِ فاش ہو گی تو صلح ہو گی، صلح ہمیشہ دشمنوں کی شکست فاش ہونے کے بعد آتی ہے، یاد رکھو کہ ہر صلح کے بعد جنگ ہوتی ہے۔ یا جنگ کی تیاری ہوتی ہے۔

صلح کے لئے کاغذ کا ایک پرزہ درکار ہوتا ہے، اور جنگ کے لئے انسانی خون، لیکن اب ہماری دنیا کے بڑے بڑے سائنس دان جنہوں نے گیس، ٹینک، توپ اور جنگ کے دوسرے ہتھیار بنائے ہیں۔ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ صلح بھی کاغذ کے پرزے کے بجائے انسانی خون سے ہو۔

اس ترکیب سے ایک فائدہ یہ ہوگا۔ کہ تیاری کا زمانہ بہت کم ہو جائے گا۔ اور ہم بڑی آسانی سے ایک جنگ کے بعد دوسری جنگ میں شامل ہو سکیں گے جنگ اس لئے کی جاتی ہے کہ صلح ہو۔ اگر جنگ کے بعد صلح ہی نہ ہو تو جنگ کون کرے گا، اس لیئے دنیا میں صلح جنگ سے بھی زیادہ ضروری ہے یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر جنگ اس لیئے کی جاتی ہے کہ صلح ہو تو صلح بھی اس لیئے کی جاتی ہے کہ جنگ ہو اور ہر اگلی جنگ پچھلی صلح کی شرطوں سے پیدا ہوتی ہے۔ صلح جنگ کی ماں ہے جس طرح ضرورت ایجاد کی ہے، اس لیئے کہو

ص ۔ صلح

ضواد، ضمیر، بچو! ضمیر اُس کانٹے کو کہتے ہیں جو انسان کی روح کے اندر چبھ کر اُسے ہمیشہ تکلیف دیتا رہتا ہے۔ تمہارے پاؤں میں کھیلتے ہوئے کئی بار کانٹا چبھا ہوگا اور تم نے محسوس کیا ہوگا کہ جب تم چلتے ہو، تو کانٹا تمہیں تکلیف دیتا ہے۔ اور اگر نہ چلو بلکہ پاؤں کو ہوا میں معلق رکھو تو یہ کانٹا کوئی تکلیف نہیں دیتا۔ بس یہی حال ضمیر کا ہے ضمیر کا کانٹا بھی انسان کو اسی وقت پریشان کرتا ہے۔ جب وہ کوئی کام کرنے سے ہلے جُلے، حرکت کرے ـــ ہاں اگر انسان ہوا میں معلق رہے تو ضمیر اُسے

پریشان نہیں کرتا۔
پچھلے زمانے میں انسان کا ضمیر اُسے بہت پریشان کیا کرتا تھا۔ اور ہزار بار یہ کانٹا نکالنے پر بھی نہ نکلتا تھا۔ لیکن موجودہ زمانے میں سائنس نے اتنی کی ہے کہ اب ضمیر کا اپریشن قابلِ عمل ہو گیا ہے۔ چنانچہ اب اپنڈے سائٹس کی فالتو آنت کی طرح ضمیر کا کانٹا بھی اپریشن کے ذریعے انسانی روح سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔ آج کل تمہیں سو میں سے ۹۹ ایسے آدمی ملیں گے۔ جن کے پاس ضمیر نہیں ہے۔ میں نے بھی مدت ہوئی۔ یہ اپریشن کرا لیا تھا۔ اور اب مجھے کسی قسم کی پریشانی نہیں ہے۔ بچو تم بڑے ہو گے تو تمہاری روح پر بھی یہ اپریشن کیا جائے گا۔ چھوٹی عمر کے بچوں پر یہ اپریشن نہیں ہو سکتا۔ گو سائنس دان اس کوشش میں ہیں کہ ہماری ذات کے اس غیر ضروری اور غیر مفید حصّے کو بچپن ہی میں کاٹ ڈالا جائے۔ لیکن اب تک انہیں کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ اس لیے جب تک ایسا ممکن نہیں کہو۔

ض۔ ضمیر

طوئے طوطا۔ بچو! طوطا اُس آدمی کو کہتے ہیں جو اپنے مالک کا سدھایا ہوتا ہے۔ اور وہی کہتا ہے جو اُس کا مالک اُس سے کہلوانا چاہتا ہے۔ تم نے اکثر ایسے طوطے دیکھے ہوں گے۔ یہ لوگ ہر جگہ، ہر ملک، ہر قوم

میں پلائے جاتے ہیں، اور گھروں میں، جلسوں میں، دفتروں میں، اسمبلیوں میں اپنے مالک کے رٹائے ہوئے فقرے بولتے رہتے ہیں۔ سچ پوچھو تو دنیا میں انہی طوطوں کی حکومت ہے۔

مالک ان طوطوں کو ہمیشہ اپنے پنجرے میں بند رکھتا ہے اور انہیں بڑے پیار سے ہر روز اپنے ہات سے کھانا کھلاتا ہے۔ کیونکہ طوطا بڑا وفادار ہوتا ہے اور اپنے مالک کے رٹائے ہوئے فقروں کے علاوہ اور کچھ نہیں بولتا!

طوطا ایک قسم کا پرندہ بھی ہوتا ہے۔ اس کا رنگ سبز، چونچ مڑی ہوئی، اور زبان چمچے کی طرح ہوتی ہے۔ یہ بھی پنجرے میں رہنا پسند کرتا ہے اور اپنے مالک کے رٹائے ہوئے الفاظ بولنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے لوگ اُسے بھی طوطا کہتے ہیں۔ لیکن پھر بھی طوطا جانور، طوطا آدمی سے کم طوطا چشم ہوتا ہے۔ اس لئے طوطا جانور کو زیادہ اہمیت نہیں جاتی۔ پس کہو۔

ط ۔ طوطا

ظ وئے ظریف، بچّو! ظریف اُسے کہتے ہیں۔ جو دوسروں کو ہنسائے۔ اور آدمی عموماً دوسروں کی تکلیف پر ہنستا ہے اس لئے سب سے

اچھا ظریف وہ ہے جو دوسروں کو تکلیف دے۔ بچو! یاد رکھو کہ تمام جانوروں میں انسان ہی ایک ایسا جانور ہے جو ہنستا ہے۔ اور کسی بھی جانور کو ہنسنا نہیں آتا۔ کیونکہ وہ دوسروں کو تکلیف میں دیکھ کر خوش نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے تو انسان کو اشرف المخلوقات کہتے ہیں۔

بچو تم نے دیکھا ہوگا کہ جب کوئی کیلے کے چھلکے پر سے پھسلتا ہے تو کتنی ہنسی آتی ہے۔ جب کوئی بازار میں ٹکرا کر گر پڑتا ہے تو ہمیں کتنی ہنسی آتی ہے۔ اُس دن جب سکول کے باہر لوبیا بیچنے والے کی ٹوکری گندی موری میں گر پڑی تھی تو تم سب بچے کس طرح قہقہہ مار کر ہنستے تھے۔ ان باتوں ہی سے پتہ چلتا ہے کہ تم سب انسان کے بچے ہو، جانور نہیں ہو!

ہنسنا انسان کے لئے بہت ضروری ہے۔ چنانچہ پچھلے زمانے میں رومن لوگ آدمیوں کو شیروں سے پھڑوا کر بہت خوش ہوتے تھے، اور ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ آجکل لوگ آدمیوں کو شیروں سے پھڑوا کر نہیں ہنستے بلکہ انہیں توپوں سے دہانے پر اڑا کر ہنستے ہیں۔ اُن کے پاؤں میں غلامی کی بیڑیاں ڈال کر قہقہے لگاتے ہیں۔ اور اسے انسانی تہذیب کی معراج سمجھتے ہیں۔ بچو! تم بھی اگر مہذب اور متمدن بننا چاہتے ہو، تو دوسروں کو تکلیف میں ڈال کر خوب ہنسو۔ قہقہے لگاؤ۔ دوسروں کو ہنساؤ اور ظریف بن جاؤ۔ اور کہو۔

ظ۔ ظریف

عین علم، بچو! تم اس وقت مجھ سے علم سیکھ رہے ہو۔ اور جب علم سیکھ جاؤ گے تو میری طرح عالم کہلاؤ گے، اور ہر ماہ پندرہ روپے پاؤ گے، جو کہ اس ملک میں ایک عالم کی تنخواہ ہے!

بچو، علم بڑی دولت ہے۔ اسے نہ چور چرا سکتا ہے۔ نہ راجہ چھین سکتا ہے۔ نہ بھائی بانٹ سکتا ہے، نہ ڈاکو ہتیا سکتا ہے۔ اس لئے جب عالم مر جاتا ہے تو اپنی دولت اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ اور اپنے بیوی بچوں کو فاقے کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کیونکہ علم بڑی دولت ہے!

علم انسان کا زیور ہے۔ جس طرح سونا عورت کا زیور ہے۔ لیکن کئی چیزیں زیور کے بنا ہی اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ جیسے چاند، ہر بچہ شروع میں چاند کی طرح ہوتا ہے لیکن بعد میں وہ پڑھ لکھ کر عالم بن جاتا ہے۔ اور نوکری حاصل کرتا ہے۔ کیونکہ علم سے نوکری ملتی ہے۔ اور نوکری سے دولت ملتی ہے۔ دیکھو میں اس سکول میں نوکر ہوں۔ اور پندرہ روپے تنخواہ پاتا ہوں۔ پندرہ روپے دولت کو کہتے ہیں، پندرہ ہزار روپے بھی دولت کو کہتے ہیں۔ پندرہ لاکھ روپے بھی دولت کہلاتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ عالم کو پندرہ روپے کی دولت ملتی ہے۔ اور کارخانے دار کو پندرہ لاکھ کی دولت۔ لیکن دولت ہر حالت میں دولت ہے۔ چاہے وہ پندرہ روپے ہو یا پندرہ لاکھ۔ اس لئے ہر عالم کو اپنی دولت پر قانع رہنا چاہیئے۔ کیونکہ علم بڑی دولت ہے!

بچو علم سیکھو۔ کیونکہ اگر علم نہیں سیکھو گے تو تمہیں نوکری نہیں ملے گی۔ اُس صورت میں تم کیا کرو گے، حلوائی کی دکان کھولو گے، تجارت کرو گے، جوتے بناؤ گے، کارخانوں میں کام کرو گے۔ کھیتی باڑی کا دھندا کرو گے۔ یعنی وہ سب کام کرو گے جو میرے ایسا عالم قابلِ فخر نہیں کرتا۔ قابلِ عزت نہیں سمجھتا۔ اس لئے بچو علم سیکھو۔ علم کے بغیر نوکری نہیں مل سکتی، اور عزت حاصل نہیں ہو سکتی۔ بلکہ مکتی بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہو

ع۔ علم

غین غدار۔ بچو! غدار بھی بنیئے اور دکاندار کی طرح ایک قسم کا تاجر ہوتا ہے بنیا آٹا، چاول، نون تیل، لکڑی بیچتا ہے۔ اور اپنے لئے منافع حاصل کرتا ہے۔ غدار اپنی قوم اور اپنا ملک بیچتا ہے۔ اور اپنے لئے منافع حاصل کرتا ہے۔ جس طرح بنیا زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ اسی طرح غدار بھی اپنی ذات کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کی فکر میں رہتا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ دنیا میں بنیئے اور منافع حاصل کرنے والوں کو تو اچھا سمجھا جاتا ہے۔ لیکن بے چارے غدار کو بُرا! درحالیکہ وہ بھی ایک تاجر ہے اور اُنہی اصولوں پر تجارت کرتا ہے۔ جن پر آجکل کی دنیا کا تجارتی اور صنعتی کاروبار چلتا ہے۔ اور جب تک تجارت کے یہی اصول رہیں گے، بنیئے کو

اچھا اور غدّار کو بُرا سمجھنا سخت ناانصافی ہے۔ مقامِ شکر ہے کہ ہندوستان میں غدّار کو برا نہیں سمجھا جاتا۔ اور جتنے غدّار ہندوستان میں پائے جاتے ہیں۔ دنیا کے کسی اور حصے میں نہیں پائے جاتے۔ ان غلاموں نے آج سے سینکڑوں سال پہلے اس ملک کو بیچنا شروع کیا تھا اور ابھی تک یہ تجارت جاری ہے۔ آریوں سے لے کر فرنگیوں کے زمانے تک یہ ملک ہر لحظہ اور ہر لمحہ بکتا رہا ہے۔ اور اب کئی دُور اندیش غدّار اسے جاپانیوں کے ہاتھوں بیچنے کے درپے ہیں۔

غدّار کی عزت ہمیشہ اپنے ملک میں کم اور اپنے ملک سے باہر زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن ہندوستان کے غدّار کی عزّت اپنے ملک میں اور باہر بھی بہت ہوتی ہے۔ ہر تجارتی فرقے کی طرح غدّاروں کا فرقہ بھی بہت دولتمند اور خوشحال ہوتا ہے۔ یہودیوں کی طرح غدّار بھی دنیا کے ہر حصے میں اور ہر ملک میں پھیلے ہوئے ہیں اور اُن کا کاروبار بین الاقوامی ہے۔ غداروں کی ملی بھگت ضرب المثل ہے۔ مصیبت کے وقت ایک وطن پرست کبھی دوسرے وطن پرست کی مدد نہیں کرتا۔ لیکن ایک غدّار ہمیشہ دوسرے غدار کی مدد کرتا ہے۔

بچّو! اگر تم عزت چاہتے ہو، آرام چاہتے ہو، عیش چاہتے ہو تو غدّار بنو۔ وطن پرست نہ بنو۔ اور کہو

غین۔ غدّار

فاقہ۔ بچو! فاقہ ہندوستانیوں کا من بھاتا کھاجا ہے۔ جس طرح مغرب میں لوگ دن میں ایک بار انڈے اور مکھن ضرور کھاتے ہیں۔ اسی طرح ہندوستانی بھی دن میں ایک بار فاقہ ضرور "کھاتے" ہیں۔ چنانچہ فاقہ ہمارے مذہب میں بھی شامل ہے اور ہماری زندگی کا ایک بہت بڑا حصّہ ہے۔

فاقے کی نعمتیں بے شمار ہیں۔ فاقہ کرنے سے آدمی کا دل ہمیشہ خدا کی طرف مائل رہتا ہے۔ اور کبھی شیطان کا رُخ نہیں کرتا۔ فاقہ نیکی سکھاتا ہے، بدی نہیں، فاقہ علم عطا کرتا ہے جہل نہیں، فاقہ آدمی کو اطاعت شعار بناتا ہے، سرکش نہیں، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی ایسی اطاعت شعار قوم دنیا کے پردے پر اور کہیں نہیں ہے!

فاقے کے بدنی فائدے بھی بے شمار ہیں۔ فاقے سے جسم موٹا نہیں ہوتا۔ اپنی اصلی حالت پر قائم رہتا ہے۔ بلکہ اور بھی چھریرا ہو جاتا ہے۔ جسم کی فالتو چربی گھل جاتی ہے۔ اور آنکھوں کی بینائی اس قدر مضبوط ہوتی ہے کہ دن کو تارے نظر آنے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہڈیوں میں اک خاص لچک بلکہ پھیلاؤ کا احساس ہوتا ہے۔ گوشت سکڑتا ہے۔ ہڈیاں پھیلتی ہیں۔ حتّٰی کہ چند دنوں میں آدمی گوشت پوست کا نہیں ہڈیوں کا ڈھانچہ معلوم ہونے لگتا ہے!

فاقے کرنے والے کو، اور ہندوستان میں ہر روز کروڑوں آدمی فاقے

سے بسر کرتے ہیں۔ پیٹ کی بیماری کم ہوتی ہے چنانچہ فاقے سے کبھی بدہضمی نہیں ہوتی، پیچش نہیں ہوتی، پیٹ میں پھوڑا نہیں ہوتا۔ اندھی آنت میں ورم نہیں ہوتا۔ معاشی نقطۂ نگاہ سے بھی فاقہ بے حد مفید ہے۔ کیونکہ فاقہ کرنے والے کو پیٹ کا دھندا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک اوسط ہندوستانی کی آمدنی ڈیڑھ آنہ ہے۔

لیکن اب ہمارے ملک کے بڑے بڑے امیر آدمیوں نے مل کر ایک پندرہ سالہ سکیم بنائی ہے جس پر عمل کرنے سے ہندوستان کی معاشی ترقی میں تگنا اضافہ ہو جائے گا۔ یعنی جبکہ پہلے ہندوستانی دن میں ایک فاقہ کرتا تھا وہاں اب تین فاقے کیا کرے گا۔

بچو اس خوبصورت لمحے کا انتظار کرو۔ اور کہو۔

ف ۔ فاقہ

ق قاعدہ، بچو! ہر کام کا ایک قاعدہ ہوتا ہے، ڈھنگ ہوتا ہے قانون ہوتا ہے، اور اس کے بغیر دنیا میں کوئی کام پورا نہیں ہو سکتا، جو لوگ دنیا میں کوئی قانون، کوئی قاعدہ نہیں چاہتے۔ انہیں ہم نراجی کہتے ہیں۔ اور جو لوگ قاعدہ اور قانون چاہتے ہیں، انہیں ہم سماجی کہتے ہیں۔ انسان ایک سماجی جانور ہے، نراجی نہیں! لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک کام ایک

ہی طرح سے ہو سکتا ہے، کام کرنے کے ڈھنگ کئی ہیں۔ اور پھر جب کام کی نوعیت بدل جاتی ہے تو اُس کا قاعدہ بھی بدل جاتا ہے انسانی سماج انسانی کاموں کے مجموعے کا نام ہے۔ جب انسانی کام بدلنے لگتے ہیں تو کام کرنے کا ڈھنگ یعنی قاعدہ بھی بدلنے لگتا ہے اور انسانی سماج میں تغیر یعنی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ عرفِ عام میں اسے انقلاب بلکہ انقلاب زندہ باد کہتے ہیں۔

انقلاب زندہ باد کا قاعدہ پرانے قاعدے سے مختلف ہے اور پرانا قاعدہ اُس پرانے قاعدے سے بھی مختلف تھا۔ اور اس طرح اگر ہم سینکڑوں سال پیچھے ــــ انسانی تہذیب کی گزشتہ صدیوں کی طرف لوٹ جائیں تو پتہ چلے گا کہ ہر چند صدیوں کے بعد یہ قاعدہ تبدیل ہوتا رہا ہے۔ اور ہوتا رہے گا۔ ایک دن یہ نیا قاعدہ بھی جو میں تمہیں آج پڑھا رہا ہوں پرانا ہو جائے گا۔ کیونکہ زندگی تغیّر کا نام ہے۔ اور جب زندگی بدلتی ہے تو اُس کے قاعدے بھی بدل جاتے ہیں۔

تمہاری آنکھوں کے سامنے اس وقت انسان کی سماج بدل رہی ہے۔ ہماری روزمرہ کی زندگی بدل رہی ہے۔ چھکڑے کے بجائے ہوائی جہاز ہے۔ بھوج پتر کے بجائے روٹری پریس ہے۔ درخت کی چھال کے بجائے مِل کا کپڑا ہے۔ اور زندگی میں ایک کی حکومت

کے بجائے سب کی حکومت ہے۔ اور ایک کی الفت کے بجائے سب کی رفاقت ہے!

یہ پرانا قاعدہ نہیں ہے۔ یہ نیا قاعدہ ہے۔ یہ بدلنے والی زندگی کا قاعدہ ہے۔ اگر بڑھنا چاہتے ہو تو پڑھو۔ اگر پڑھنا چاہتے ہو تو پڑھو۔ اگر جینا چاہتے ہو تو پڑھو۔ ورنہ موت اور غلامی تو قسمت میں لکھی ہی ہے۔ اور تمہارے اس پیدائشی حق کو تم سے کوئی چھین نہیں سکتا!!!—— اس لئے کہو۔

ق ۔ قاعدہ

کاف کتا، بچو، کتا بڑا وفادار جانور ہے۔ یہ گھر میں دن بھر زنجیر سے بندھا رہتا ہے اور مہمانوں کو دیکھ دیکھ کر غراتا ہے۔ اور جب گھر میں مہمان نہ ہوں تو زنجیر سے بندھے سو جاتا ہے۔ اور پھر خواب میں مہمانوں کو دیکھ دیکھ کر غراتا ہے اور بھونکتا ہے کیونکہ کتا بڑا وفادار جانور ہے اور انسان کا بہترین دوست ہے۔

گھر کا کتا دن کو سوتا ہے اور رات کو جاگتا ہے، اور باغیچے کی چار دیواری کے گرد گھومتا ہے۔ اور بجلی کے کھمبوں، پولیس کے سپاہیوں اور چوکیداروں کو دیکھ دیکھ کر بھونکتا رہتا ہے کیونکہ بے اجازت اندر آنا ہے منع، کتے کو اپنی آواز پیاری معلوم ہوتی ہے۔ وہ اسے خود بھی سنتا ہے اور دوسروں کو

بھی بار بار سناتا ہے۔ چنانچہ رات بھر گھر کے لوگ اپنے کتّے کی وفادار اور شیریں آواز سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ کتّا انسان کا بہترین دوست ہے اور بڑا وفادار جانور ہے۔

گھر کا کتّا تو دن کو سوتا ہے، لیکن گلی کا کتّا نہ دن کو سوتا ہے نہ رات کو، بلکہ ہر وقت جاگتا رہتا ہے۔ اور چلّا چلّا کر انسانوں کو تاریکی کے مہیب خطرے سے آگاہ کرتا رہتا ہے، اس کی وفاداری اس خطرناک حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ وہ گلی میں سے گزرنے والے ہر فرد کو اجنبی اور اسے کاٹ کھانا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ یہ بھی کتّے کی وفاداری کا ایک بدیہی ثبوت ہے۔ جب کتّا پیار سے کاٹ کھائے تو اس کا زیادہ فکر نہ کرنا چاہیئے۔ ہسپتال میں جاکر اپنے پیٹ میں چھپکے سے چودہ انجکشن لگوا لینے چاہئیں۔ کیونکہ کتّے کی خوشی اسی میں ہے، اور کتّا بڑا وفادار جانور ہے۔ تم نے اس وفادار کتّے کی کہانی تو ضرور سنی ہوگی جس نے اپنے شکاری مالک کی غیر حاضری میں اس کے بیٹے کو بھیڑیئے کے حملے سے بچا لیا تھا۔ اس قسم کے کتّے صرف کہانیوں میں پائے جاتے ہیں —

ورنہ عام گھروں میں جو کتّے ہوتے ہیں۔ وہ بچّوں کو بھیڑیوں سے نہیں بچاتے، موقعہ ملے تو انہیں خود کاٹ کھاتے ہیں۔ اور بچوں ہی پر کیا موقوف ہے۔ یہ کتّے تو بڑے بڑے بوڑھوں پر بھی دانت رکھتے ہیں۔

مثل مشہور ہے کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے، کتّے کے عشق کا

بھی یہی حال ہے اور وہ دن رات بازاروں میں اور گلی کوچوں میں رسوا ہوتا پھرتا ہے۔ کتّے کو دیکھ کر آج کل انسانوں نے بھی اپنے عشق کا اسی طرح اظہار کرنا شروع کیا ہے۔ کتّے کے متعلق کئی ضرب الامثال مشہور ہیں کتا کتے کا بیری ہوتا ہے۔ کتا بلّی کا دشمن ہے، کتّے کو گھی ہضم نہیں ہوتا۔ دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ ان تمام کہاوتوں سے کتّے کی وفاداری پر بڑی روشنی پڑتی ہے۔ کتا کسی زمانے میں بھیڑیا تھا۔ اب صرف کتا ہے اور انسان کا وفادار غلام ہے، اب اُس نے جنگل چھوڑ دیا ہے۔ اور انسان کی اطاعت اختیار کی ہے۔ اس کے صلے میں انسان نے اُس کے گلے میں زنجیر باندھی ہے اور اسے اپنے ہم نسل کتوں سے نفرت کرنا سکھایا ہے، یہی وفاداری اور غلامی کا پہلا اور آخری سبق ہے۔

کتّے، کتّے ہوتے ہیں اور کتّے انسان بھی ہوتے ہیں۔ انسان کتّے بھی اپنے مالک کی عطا کی ہوئی زنجیر سے بندھے ہر وقت عف عف کرتے رہتے ہیں۔ اور اپنے مالک کا اشارہ پاکر دُم ہلانے لگتے ہیں۔ ان کتوں کو گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے کھانے کے لیئے دیئے جاتے ہیں اور دودھ بھرے پیالے ہر وقت اُن کے سامنے رکھے رہتے ہیں۔ چاہے دنیا کے دوسرے کتّے بھوکے ہی کیوں نہ مرجائیں۔ یہ اس لئے ہوتا ہے کیونکہ ان کتوں کے گلے میں مالک کا پٹا ہوتا ہے اور ایک لمبی طلائی زنجیر

ہوتی ہے اور یہ کتے مالک کے بڑے وفادار ہوتے ہیں۔

بچو! جب تم بڑے ہو گے تو کتے کی وفاداری کو کبھی نہ بھولنا، پھر —— ایک دن تمہیں بھی اک لمبی سی زنجیر مل جائے گی۔ اور گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے اور دودھ بھرے پیالے۔ اور جنگل میں بھیڑیئے بھوکے ہوں گے۔ بے وقوف —— آؤ بچو ہم کتے کی وفاداری اور اطاعت شعاری کے گن گائیں اور کہیں۔

ک ۔ کتا

گ گالی، بچو! تمہیں گالی دینا پسند ہے نا؟ الف بے تے سیکھنے سے بہت پہلے تم گالی دینا سیکھ جاتے ہو۔ میں نے تمہیں کھیل کے دوران میں اکثر گالی دیتے سنا ہے۔ تم گالی بک کر بہت خوش ہوتے ہو۔ خصوصاً ماں بہن کی گالی!

لیکن بچو اگر تم ذرا سوچو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ ماں بہن کی گالی دراصل کوئی گالی نہیں ہے۔ اس گالی سے تمہاری اس دلچسپی کا اظہار ضرور ہوتا ہے۔ جو تمہیں مخالف جنس ہے۔ کیونکہ الف، بے، تے سیکھنے سے پہلے ہی تم یہ بات جان لیتے ہو کہ لڑکے اور لڑکیوں کی جنس الگ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ لڑکے لڑکیوں کو اور لڑکیاں لڑکوں کو پسند کرتی ہیں۔ اور جب یہ لڑکیاں اور

لڑکے جوان ہوتے ہیں۔ تو ایک دوسرے سے بیاہ کرتے ہیں۔ اور وہی فعل سرانجام دیتے ہیں۔ جس کی تم گالی دیتے ہو۔ بھلا اس گالی میں کیا بُری بات ہے اگر یہ گالی ہے۔ تو پھر تم خود ایک گالی ہو۔ تمہاری پیدائش گالی ہے، تمہارا وجود گالی ہے۔ کیونکہ اسی گالی کی وجہ سے اپنی ماں کے پیٹ سے جنے گئے ہو، تم آسمان سے نہیں گرے ہو۔ نہ ہی تم پریوں کے ملک سے آئے ہو۔ نہ ہی تم سارس کی چونچ سے برآمد ہوئے ہو۔ یہ کہانیاں تم سے تمہاری حقیقت کو چھپانے کے لئے بیان کی جاتی ہیں۔ در اصل تم اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہو۔ جس طرح خوبصورت پلّے اور بلّی کے حسین بلُونگڑے اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہیں۔ تم دکھ درد، مصیبت اور ماتما کی اولاد ہو۔ اسی لئے اس قدر معصوم اور خوبصورت ہو۔ لیکن میں نے آج تک کسی خوبصورت پلّے اور میاؤں میاؤں کرتے ہوئے بلّی کے بچّے کو ماں بہن کی گالی دیتے نہیں سنا۔ پھر تم انسان کے بچّے ہو کر کیوں اپنے آپ کو گالی دینے میں فخر محسوس کرتے ہو۔

بچو! ماں بہن کی گالی کوئی گالی نہیں ہے۔ جب کبھی تمہیں کوئی ایسی گالی دے تو خاموش ہو جاؤ۔ مسکرا کر گالی دینے والے کو سمجھا دو۔ کہ یہ گالی نہیں ہے، یہ تو اپنا منہ چڑانا ہے، اپنے آپ پر تھوکنا ہے۔

گالی وہ ہوتی ہے جب ایک انسان دوسرے انسان کو بھوکا رکھتا ہے!

گالی وہ ہوتی ہے جب کوئی تمہیں شریف، غلام اور اطاعت شعار بناتا ہے
گالی وہ ہوتی ہے جب کوئی تمہیں محبّت سے، رفاقت سے، حسن سے، آزادی سے محروم کر دیتا ہے۔ ایسی حالت ایک مسلسل ہوتی ہے! اُسے گالی دو جو تمہیں اپنے برابر کا نہ سمجھے، جو تمہیں غلام بنانا چاہے، جو تمہارے گلے میں پٹہ اور زنجیر ڈالنا چاہے۔ جو تمہاری وفاداری پر پیٹھ ٹھونکنا چاہے، تمہیں یتیم خانے میں رکھ کر خیرات حاصل کرنا چاہے، تمہارے حسن کو بازار میں فروخت کرنا چاہے، تمہارے عشق کا گلا گھونٹنا چاہے، تمہاری آزادی کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہے۔ اُس وقت گالی دو۔ ضرور گالی دو۔ میں گالی کو بُرا نہیں سمجھتا، لیکن سچی گالی دو۔ چھوٹی گالی دینے سے ہمیشہ احتراز کرو۔ اور کہو

گ ۔ گالی

لام لوہا، بچّو! لوہا تم نے اکثر دیکھا ہوگا۔ یہ ایک سیاہ رنگ کی سخت دھات ہے۔ یہ دیکھو۔ تمہارے چاقو کا پھل لوہے سے بنا ہے۔ سلیٹ کے چوبی چوکھٹے میں جو پترے جڑے ہیں وہ لوہے کے ہیں۔ تمہارے قلم میں جو نب ہے وہ لوہے سے بنا ہے، درزی کی سوئی بھی لوہے سے بنی ہے —— جارج واشنگٹن کا کلہاڑا بھی لوہے سے بنا تھا۔ الغرض لوہے سے بشمار چیزیں بنتی ہیں۔

آج کل لوہے سے مشینیں بھی بنتی ہیں اور مشینوں سے انسان وہ تمام کام کرتا ہے، جو وہ پہلے اپنے ہات سے کیا کرتا تھا۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوا ہے کہ مشینیں روز بروز بڑی ہوتی جا رہی ہیں اور انسان کے ہاتھ چھوٹے ہوتے جا رہے ہیں۔ کیونکہ ابھی انسان کو مشین سے کام لینا نہیں آیا۔

جنگیں ہمیشہ لوہے سے لڑی جاتی ہیں۔ کیونکہ انسانوں کو قتل کرنے کے جتنے ہتھیار ہیں وہ لوہے سے بنتے ہیں۔ اسی لئے لوہے کو دھاتوں کا بادشاہ کہتے ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ گزشتہ جنگِ عظیم اور اس جنگ میں اب تک جتنے آدمی ہلاک ہو چکے ہیں اُن کی تعداد ان تمام گزشتہ جنگوں کی تعدادِ اموات سے زیادہ ہے جو آج تک دنیا میں لڑی جا چکی ہیں۔ صرف ایک اسی بات سے پتہ چلتا ہے کہ لوہا کتنی کار آمد دھات ہے، اسی لئے تو جن قوموں کے پاس لوہا ہوتا ہے۔ وہ بڑی قومیں جن کے پاس لوہا نہیں ہوتا یا کم مقدار میں ہوتا ہے وہ چھوٹی قومیں کہلاتی ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ابھی تک لوہا انسان کے لئے اتنا کار آمد ثابت نہیں ہؤا، جتنا ایک پھول، ایک قہقہہ یا ایک گیت، لیکن ایسے لوگوں کو عموماً خبطی کہا جاتا ہے۔ ایسے پر ہمیشہ دنیا کی پھٹکار برستی رہتی ہے۔ اور وہ اکثر قید خانوں یا پاگل خانوں میں بند کر دیئے جاتے ہیں۔ کیونکہ آجکل لوہے کا زمانہ ہے۔ گیت کا زمانہ نہیں، قہقہے کا زمانہ نہیں۔ پھول کا زمانہ نہیں، وہ

زمانہ ابھی نہیں آیا۔ اور جب آئے گا تب تلک یہ خبطی شاید گور نشین ہو چکے ہوں گے۔ اب تو لوہے کا زمانہ ہے۔ اور لوہے اور کوئلے کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اور جہاں یہ دونوں مل جاتے ہیں۔ وہیں انسانوں کا خون بہتا ہے اس لیئے کہو۔ کاف کوئلہ۔ خے خون اور

ل ۔ لوہا

میم موت، بچّو! تم موت سے ڈرتے ہو کیا؟ لیکن موت سے کسی کو نہ ڈرنا چاہیئے۔ صرف زندگی سے ڈرنا چاہیئے۔ زندگی بڑی بھیانک اور خونخوار ہوتی ہے۔ موت آرام اور سکون بخشنے والی ہوتی ہے۔ بچّو! ابھی تو تم زندگی کی پہلی منزل پر ہو۔ اور تمہیں سکول سے، سکول ماسٹر سے، قاعدے سے، مانیٹر سے، تختہ سیاہ سے، ہر شے سے ڈر لگتا ہے۔ لیکن ابھی تو یہ زندگی کی پہلی منزل ہے جوں جوں زندگی بڑھتی جائے گی، تمہارے ڈر میں، تمہاری مصیبتوں میں، تمہاری کمینگی میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اب تم کھل کر ہنستے ہو۔ پھر ڈر کر ہنسو گے، اب جو بات تمہارے جی میں آئے صاف کہہ دیتے ہو، پھر رک رک کر بات کرو گے۔ اب تمہیں خدا کا بھی ڈر نہیں ہے۔ پھر تم ہر شے، حقیر سے حقیر شے سے بھی ڈرو گے، اب تو تم صرف سکول سے ڈرتے ہو نا۔ پھر دفتر سے ڈرو گے۔ گھر سے ڈرو گے، مندر اور مسجد سے ڈرو گے، اور یہ ڈر بڑھتا چلا جائے گا۔ حتےٰ کہ تم

بچپن سے، لڑکپن اور لڑکپن سے شباب اور شباب سے بڑھاپے میں داخل ہو کر موت کی آغوش میں سو جاؤ گے لیکن جب تک زندہ رہو گے ہمیشہ ڈرتے رہو گے ہمیشہ ڈرتے رہو گے، کیونکہ ہمارے بڑے آدمیوں نے ہماری سماج کی بنیاد، اُس دنیا کی بنیاد جس میں ہم رہتے ہیں ڈر پر رکھی ہے! محبت پر نہیں رفاقت پر نہیں، محنت پر نہیں، مساوات اور برادرانہ تعلقات پر نہیں۔ صرف ڈر پر! ـــــ موت نہیں زندگی بھیانک ہے!

بچو! مشہور جرمن شاعر رِلکے نے ایک دفعہ خدا سے دعا مانگی۔ "میں تجھ سے زندگی اپنی مرضی کے مطابق نہیں مانگتا۔ میں تجھ سے صرف موت طلب کرتا ہوں۔ اپنی مرضی کے مطابق موت!"

آؤ بچو! ہم بھی یہی دعا مانگیں۔ کیونکہ مر جانے کے بعد یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ مرحوم کس طرح جیا بلکہ یہ کہ وہ کس طرح مرا۔ اس لئے کہو۔

م ـ موت

نون ننگا، بچو! تم اکثر ننگ دھڑنگ گلیوں میں پھرتے رہتے ہو اور تمہیں کوئی بُرا نہیں کہتا۔ تمام جانوروں میں سے صرف انسان ہی ایک ایسا جانور ہے جو کپڑے پہنتا ہے، اور باقی جانوروں کو جو ہمیشہ ننگے رہتے ہیں کبھی کوئی بُرا نہیں کہتا۔ نہ اُن پہ بد اخلاقی کا الزام عاید کیا جاتا ہے۔ یہ

بداخلاقی صرف کپڑے پہننے والے انسان کا خاصہ ہے۔ شاید اسی لئے ہندوستان میں سادھو، مہنت، مہاتما ہمیشہ ننگے رہ کر زندگی بسر کرتے ہیں۔

اب تو تم ننگے گھومتے ہو، لیکن جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو تمہیں ننگا پھرنے سے باز رکھا جائے گا۔ اس وقت تم گلیوں میں کپڑے پہن کر گھومو گے اور لوگوں کی بہو بیٹیوں کو تاکا کرو گے۔ یہ بداخلاقی تو ضرور ہے لیکن عریانیت نہیں اور اس ملک میں عریانیت یعنی ننگے پن کو بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ جزیرہ بالی کے مرد، عورتیں، ملایا کے لوگ، افریقہ کے حبشی عموماً ننگے رہتے ہیں۔ اس لئے وہ سب کے سب بُرے ہیں۔ غیر مہذب ہیں۔ ننگا رہنا تہذیب کے خلاف ہے۔ اور تہذیب ہر اُس بُری چیز کو کہتے ہیں۔ جسے کپڑوں میں چھپا کر اچھا دکھایا جائے۔

یونانی، ہندی، بودھ، مسیحی، سنگتراشی اور مصوری کے بہترین نمونے وہ ہیں جنہیں انسان کے جسم کو اُس کی اصلی حالت میں دکھایا گیا ہے، ہات، پاؤں، سینہ، رانیں، اعضائے تناسل ہر شے، ننگی نظر آتی ہے۔ اسی طرح مغربی اور مشرقی موسیقی، شاعری، ادب کے بہترین ٹکڑے وہ ہیں جنہیں انسان اور انسان کے جذبات بالکل ننگے اور اپنی اصلی حالت میں دکھائے گئے ہیں۔

لیکن یہ پرانی باتیں ہیں۔ آجکل ننگا رہنے کو بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ گو مجھے معلوم ہے کہ تمہیں ننگا رہنا پسند ہے۔ لیکن کیا کروں انسپکٹر صاحب کا

حکم ہے کہ تمہیں ننگا پھرنے سے باز رکھوں، اس لئے میں تمہیں ننگا رہنے کا سبق نہیں دے سکتا۔ اس لئے بچّو ننگے نہ پھرو۔ کبھی ننگے نہ پھرو۔ اصل کو، حقیقت کو، اپنے آپ کو، جو کچھ تم ہو۔ کپڑوں میں چھپا لو۔ جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو یہی عادت تمہارے لئے بہت مفید ثابت ہو گی۔ کیونکہ اس وقت تمہیں پتہ چلے گا۔ کہ انسپکٹر صاحب کا حکم نہ صرف اسکول میں چلتا ہے۔ بلکہ شاعری، ادب موسیقی، دفتر، سماج، مذہب، زندگی کے ہر شعبے میں چلتا ہے۔ عریانیت گناہ ہے! بچّو! اگر یہی دستور رہا تو وہ دن دور نہیں، کہ جب انسان کے جسم پر صرف کپڑے ہی کپڑے رہ جائیں گے۔ اور اندر کچھ نہ ہو گا۔ یہ ہماری انسانی تہذیب کی معراج ہو گی۔ اس لئے بچو کپڑے پہنو، مہذب بنو۔ اور کہو۔

ن ۔ ننگا

ہ ۔ ہندو، بچّو ہندو اُسے کہتے ہیں جو مسلمان کا دشمن ہو اور پھر وہ کام کرے جو مسلمان نہ کرتا ہو۔ چنانچہ مسلمان گوشت کھاتا ہے، ہندو ترکاری کھاتا ہے، مسلمان سر منڈاتا ہے، ہندو سر پہ چوٹی رکھتا ہے، مسلمان گائے کو حلال کرتا ہے، ہندو اُسے ماتا سمجھ کر پوجتا ہے، مسلمان سؤر کو حرام سمجھتا ہے۔ ہندو اُس کا اچار ڈالتا ہے۔ مسلمان مسجد میں جاتا ہے۔ ہندو مندر میں، مسلمان خاموشی سے نماز ادا کرتا ہے، ہندو شنکھ اور گھڑیال بجا کر آرتی اُتارتا ہے، اس پر بھی ہندو اور

مسلمان دونوں بھائی بھائی ہیں۔

ہندو پرتھوی راج چوہان کی عزت کرتا ہے، مسلمان شہاب الدین غوری کی، ہندو رانا سانگا کو پوجتا ہے، مسلمان بابر کی شان میں قصیدے کہتا ہے۔ ہندو رانا پرتاپ کو اکبر سے بڑا خیال کرتا ہے، مسلمان اکبر کو رانا پرتاپ پر ترجیح دیتا ہے، ہندو کا ہیرو شیواجی ہے اور مسلمان کا اورنگ زیب، اس پر بھی ہندو اور مسلمان بھائی بھائی ہیں۔

ہندو جس محلے میں رہتا ہے وہاں مسلمان کو گھسنے نہیں دیتا، ہندو جس چوکے میں کھانا کھاتا ہے وہاں مسلمان کا قدم نہیں پڑ سکتا۔ ہندو جس کمرے میں سوتا ہے وہاں مسلمان کا سایہ نہیں پڑ سکتا۔ ہندو جل پیتا ہے، مسلمان پانی، مسلمان بیوی کو طلاق دیتا ہے، ہندو اُسے ساری عمر اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ مسلمان مر کر دفن ہونا پسند کرتا ہے۔ ہندو آگ پر جلنے کو ترجیح دیتا ہے اس پر بھی ہندو اور مسلمان بھائی بھائی ہیں۔

ہندو مسلمان کو ملیچھ سمجھتا ہے، مسلمان ہندو کو کافر خیال کرتا ہے۔ مسلمان ذات پات میں یقین نہیں رکھتا۔ ہندو اُسے اپنی تہذیب کا مرکز قرار دیتا ہے۔ ہندو کی مقدس زبان سنسکرت ہے، مسلمان کی عربی۔ ہندو ٹیگور کو شاعرِ مشرق سمجھتا ہے، مسلمان اقبال کو، ہندو اکھنڈ ہندوستان چاہتا ہے، مسلمان پاکستان اس پر بھی ہندو اور مسلمان بھائی بھائی ہیں۔

اگر ہندو اور مسلمان دونوں بھائی بھائی ہیں تو "دشمن" کے لئے اک نیا لفظ ایجاد کرنا پڑے گا۔ لیکن جب تک کوئی ایسا لفظ نہیں گھڑا جاتا۔ تم یہی سمجھو کہ ہندو مسلمان کا دشمن ہے اور ہندو اور مسلمان دونوں بھائی بھائی ہیں۔ اور یہ دونوں بھائی ایک ملک میں رہتے ہیں۔ جس کے متعلق کہا گیا ہے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" اور "اے آبِ رودِ گنگا!" اسی ملک میں جہاں ہندو اور مسلمان بستے ہیں۔ چند ایسے لوگ بھی موجود ہیں۔ جو اپنے آپ کو "انسان" کہلانا پسند کرتے ہیں۔ خدا کے بندے، لیکن ان لوگوں کی غلط فہمی ہے۔ یہ لوگ خدا کے بندے نہیں ہیں۔ بلکہ ناستک ہیں، ملحد ہیں، دہریے، خطرناک بھیڑیئے۔ بچو! تم جہاں بھی ان آدمیوں کو دیکھ پاؤ۔ فوراً ان کے منہ پر تھوک دو۔ کہ انسپکٹر صاحب کا یہی حکم ہے۔

ہندو اور مسلمان دونوں بھائی بھائی ہیں۔ اور ایک دوسرے کو برادرانِ وطن کہتے ہیں۔ برادرانِ وطن جب جوشِ محبت میں آ کر ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ تو فساد ظہور میں آتا ہے۔ فساد بڑے مزے کا کھیل ہے۔ اور ہندوستان میں اکثر کھیلا جاتا ہے۔ کیونکہ یہاں ہندو اور مسلمان کثیر تعداد میں رہتے ہیں۔ فساد عموماً پنڈت اور مولوی سے شروع ہوتا ہے اور دفعہ ۱۴۴ پر ختم ہوتا ہے اس دوران میں خون کی ندیاں بہتی ہیں۔ جنہیں ہندو اور مسلمان بڑی خوشی سے نہاتے ہیں۔ اس کے بعد پولیس صورتِ حالات پر قابو پا لیتی ہے۔ اور پھر دوسرے

فساد کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ بڑے مزے کا کھیل ہے۔ اور چونکہ ہندو مسلمانوں کو کبھی اس کھیل سے فرصت نہیں ملتی۔ اس لئے انہوں نے یہ کام انگریزوں کو سونپ رکھا ہے۔ جو ہمیشہ ان دونوں بھائیوں کے درمیان انصاف کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کو انصاف پسند کہا جاتا ہے۔ اور ہندو مسلمانوں کو فساد پسند، اور جو لوگ فساد پسند نہیں ہیں اُنہیں ترقی پسند کہا جاتا ہے۔ لیکن ملک میں ایسے جاہلوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اس لئے کہو۔

۵ - ہندو

واؤ وزیر، وزیر حکومت کا نائب ہوتا ہے۔ وزیر ریاست کے سب بڑے آدمیوں میں سے بڑا ہوتا ہے، اور وزیر سے بڑا صرف بادشاہ ہوتا ہے یا گورنر ہوتا ہے، اور گورنر کو لاٹ صاحب بھی کہتے ہیں۔

تم نے اکثر پریوں کی کہانی میں سنا ہوگا، کہ بادشاہ راج کرتے ہیں۔ اور وزیر صلاح دیتے ہیں۔ پچھلے زمانے میں جو پریوں کا زمانہ نہیں تھا۔ اُس میں بھی وزیر بادشاہ کو صلاح دیتے تھے اور بادشاہ اُن کے کہنے پر چلتا تھا۔ لیکن آجکل یہ ہوتا ہے۔ کہ بادشاہ یا گورنر صلاح دیتے ہیں اور وزیر اُن کے کہنے پر چلتے ہیں۔ اس انتظام کو صوبجاتی خود مختاری یا صوبجاتی سوراج کہا جاتا ہے۔ ہندوستان میں آجکل یہی دستور رائج ہے!

پریوں کی کہانی میں تم نے اکثر دیکھا ہوگا۔ کہ وزیر عقلمند ہوتا ہے۔ اور بادشاہ بے وقوف۔ کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ بادشاہ عقلمند ہوتا ہے اور وزیر بیوقوف لیکن آجکل بادشاہ اور وزیر دونوں عقلمند ہوتے ہیں۔ صرف رعیّت بیوقوف ہوتی ہے۔ اور اگر نہیں ہوتی تو بنائی جاتی ہے۔ اور اگر پھر بھی نہ بنے تو جیل میں ٹھونس دی جاتی ہے۔ اس قسم کی حکومت کو جمہوری سلطنت کہتے ہیں۔

پریوں کے زمانے میں ایک بادشاہ ہوتا تھا۔ ایک وزیر، دونوں الگ رہتے تھے۔ اور دونوں کے کام بھی الگ تھے۔ لیکن آج کل کئی ملکوں میں ایک ہی آدمی بیک وقت بادشاہ ہے اور وزیر بھی، وہ خود ہی مشورہ دیتا ہے، اور خود ہی اُس پر عمل کرتا ہے۔ ایسے آدمی کو ظاہر ہے نہ بادشاہ کہا جا سکتا ہے۔ نہ وزیر، اس لئے اسے ڈکٹیٹر کہتے ہیں۔ ڈکٹیٹر اپنے ملک میں اکیلا حاکم ہوتا ہے، وہ خود ہی مشورہ دیتا ہے۔ خود ہی اُس پر عمل کرتا ہے۔ رعایا صرف تالی بجاتی ہے۔ واہ واہ کرتی ہے، اور اپنے خون کے دریا بہاتی ہے۔ کیونکہ ڈکٹیٹر کو خون بہانے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ اس قسم کی حکومت کو فسطائی حکومت کہتے ہیں۔

لیکن پرستان کی دنیا میں ڈکٹیٹر نہیں ہوتے۔ پرستان کی کہانی میں صرف بادشاہ اور وزیر اور شہزادے اور شہزادیاں ہوتی ہیں۔ چند سرپھرے لوگ اس کوشش میں ہیں کہ اس دنیا کو بھی پرستان بنا ڈالیں۔ جہاں ہر لڑکا شہزادہ ہوگا۔

ہر لڑکی شہزادی، عنقریب ان لوگوں کے لئے ایک پاگل خانہ کھلنے والا ہے۔ جہاں یہ سب لوگ زندہ دفنا دیئے جائیں گے۔اس لئے بچو ان لوگوں کا کبھی اعتبار نہ کرو۔ اور زور سے کہو۔

ی۔ وزیر

ی یاد، یہ اس قاعدے کا آخری حرف ہے۔ اور سب سے ضروری، یے یاد ہے، اور یاد کئے بغیر تم اس قاعدے کو کبھی ذہن میں نہ رکھ سکو گے۔ اور اسے بہت جلد بھول جاؤ گے، اور میں نہیں چاہتا کہ تم یہ قاعدہ بھول جاؤ۔ کیونکہ اگر تم نے نیا قاعدہ بھُلا دیا۔ تو تم اپنے لئے اور اس طرح دنیا کے لئے بھی نئی زندگی نہ بنا سکو گے۔ اس لئے یاد کرو۔ پھر یاد کرو۔ پھر یاد کرو۔ اس قاعدے کو ہمیشہ کے لئے یاد رکھو!

نیا قاعدہ تمہارے لئے کیوں ضروری ہے؟ ممکن ہے میں تمہیں اس کا جواب خاطر خواہ نہ دے سکوں۔ اس لئے نہیں کہ تم بچے ہو۔ بلکہ اس لئے کہ میں ایک معمولی سکول ماسٹر ہوں۔ ہاں۔ میں ایک معمولی سکول ماسٹر ہوتے ہوئے بھی اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جب میں دیکھتا ہوں کہ امجد پھٹے کپڑے پہنے سکول میں آتا ہے۔ اور موہن ریشم کا لباس پہنے آتا ہے، جب میں دیکھتا ہوں کہ گوردیال شہد اور مکھن سے ناشتہ کرتا ہے۔ اور چنوں کے پاس لوبیا کھانے کے لئے

بھی ایک پیسہ نہیں ہوتا۔ جب میں دیکھتا ہوں۔ کہ ارشد کی آنکھیں کنول کی طرح روشن ہیں اور اس کے بالوں میں خوشبودار تیل رچا ہوا ہے اور اُس کے دانت موتیوں کی طرح مصفا ہیں اور منو کی آنکھیں سرخ ہیں۔ اور لبوں پر پیاس کی پپڑیاں ہیں۔ اور آنسوؤں کے شبنمی سائے اُس کی بڑی بڑی، سہمی سہمی، حیران حیران پتلیوں پر جھلک رہے ہیں۔ اُس وقت مجھے محسوس ہوتا ہے کہ دنیا کو اک نئے قاعدے کی ضرورت ہے!

پھر یہ نیا قاعدہ میں تمہیں کیوں پڑھا رہا ہوں۔ کیوں میں اس قاعدے کو بڑے بوڑھے زیرک دانشوروں کے پاس نہیں پہنچاتا۔ اور ان سے درخواست نہیں کرتا کہ وہ اس قاعدے کو ساری دنیا میں رائج کر دیں؟ کیوں میں اپنے قاعدے کے لئے بچوں سے امداد کا طالب ہوں۔ بچے جو کمزور ہیں، جو ننھے ہیں۔ جو معصوم ہیں۔

بس اسی لئے تو میں تمہارے پاس آیا ہوں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم ننھے ہو۔ اور کمزور ہو اور معصوم ہو۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم کھلونوں سے کھیلتے ہو پریوں سے محبت کرتے ہو، درختوں سے باتیں کرتے ہو۔ تاروں کی نگاہیں پہچانتے ہو۔ اور اپنے دل میں وہ دولت رکھتے ہو جو ڈوبتے ہوئے سورج کے سارے سونے میں نہیں ہے ـــــ اسی لئے میں یہ قاعدہ لے کر تمہارے پاس آیا ہوں کہ تم بڑے ہو کر اس دولت کو دنیا بھر میں پھیلا دو۔ تاکہ ہر بچے

کا لباس ریشم کا ہو جائے، اُس کی آنکھوں میں خوشی اور ذہانت چمکنے لگے۔ وہ پرستان کی کہانی نہ سُنے۔ پرستان میں رہے!

بچّو! اگر تم نے نئے قاعدے کو یاد رکھا تو تم یہ سب کچھ کر سکو گے۔ اِس لئے اسے یاد رکھو اور کہو۔

ی - یاد

مشق اوّل

انگریز انسان ہے، ہندوستانی انسان ہے، انسان، انسان پر حکومت کرتا ہے، حکومت چور کو سزا دیتی ہے، چور ڈاکو کا چھوٹا بھائی ہے۔ سب انسان بھائی بھائی ہیں!

موہن آم کھاتا ہے، بنیا سود کھاتا ہے، ٹامی مکھن کھاتا ہے، بنگالی بھوکا رہتا ہے، راجہ محل میں رہتا ہے، رانی ریشم کے کپڑے پہنتی ہے، میری بہن کا نام رانی ہے۔ لیکن اُس کے پاس ریشم کے کپڑے نہیں ہیں۔

خربوزہ کھا، خربوزہ نہ پہن، ہیضے سے مر، بھوک سے نہ مر، گالی بک چپ نہ رہ، یہ پھوٹ کا میوہ ہے، اسے دساور بھیج۔

راجہ آیا۔ ہاتھی آیا۔ ڈاکو آیا، قحط آیا، ذخیرہ کہاں ہے، یہ تو کاغذ کا ذخیرہ ہے اناج کا ذخیرہ کہاں ہے۔ ڑال بن۔ چوہا نہ بن۔ ذخیرے پر قبضہ کر،

مشق دوم

آج جنگ ہے، کل صلح ہو گی۔ پرسوں پھر جنگ ہو گی۔ اس کا نام ترقی ہے ترقی انسان کرتے ہیں، ہندو مسلمان فساد کرتے ہیں۔ ہندو، ہندو جل پیتا ہے، مسلمان، مسلمان پانی پیتا ہے۔ انسان کے لئے پانی کہاں ہے؟

شراب انگور سے بنتی ہے، غلامی وفاداری سے آتی ہے، کتا بڑا وفادار جانور ہے، کتا گھر میں رہتا ہے۔ بھیڑیا جنگل میں رہتا ہے۔ کتے کے گلے میں زنجیر ہے۔ زنجیر کو توڑ دے، دودھ کا پیالہ چھوڑ دے!

موہن بڑا اچھا طوطا ہے، یہ جان کے پنجرے میں بولتا ہے۔ "ہپ ہپ ہرّا" امجد سمتھ کے پنجرے میں ہے، امجد بولتا ہے "وریں چہ شک"۔ موہن ہندو ہے، امجد مسلمان ہے، ہندو مسلمان کا دشمن ہے۔ موہن اور امجد بھائی بھائی ہیں۔ بھائی لڑتے ہیں، غدار ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔

مشق سوم

ڈکٹیٹر خون بہاتا ہے۔ پرستان میں ڈکٹیٹر نہیں ہوتا، عالم کے پاس پندرہ روپے ہیں۔ کارخانے دار کے پاس لاکھوں روپے ہیں، ہندوستانی کے پاس ڈیڑھ آنہ ہے۔ پندرہ سال کے بعد ہندوستانی کے پاس چار آنے ہوں گے،

شکست کے بعد

پندرہ سال میں پانچ ہزار چار سو پچھتر دن ہوتے ہیں۔ ہندوستانی چالیس کروڑ ہیں۔ ہندوستان میں بلبلیں رہتی ہیں۔

بچّہ ننگا پھرتا ہے۔ پتلون نہیں پہنتا، پتلون پہنے گا تو نوکری ملے گی، نوکری سے عزّت ملتی ہے، نوکری کر، بیوی، دام حاصل کر۔ سوہن کے پاس بہت سے دام ہیں۔ موہن کے پاس ایک چھدام نہیں، موہن غریب ہے۔ غریب چوری کرتا ہے، حاکم حکومت کرتا ہے۔

راجہ تخت پر بیٹھتا ہے، رعایا ہل چلا رہی ہے، یہ جھونپڑا ہے۔ وہ محل ہے۔ گالی نہ بک، نیا قاعدہ پڑھ، پرانا قاعدہ بھول جا۔

گھر جا، ڈاکو سے لڑ، پنجرا کھول دے۔ آج رات ہے، کل صبح ہو گی، سورج نکلے گا۔ انسان آئے گا۔ بچے کھیلیں گے، قہقہے لگائیں گے، گیت گائیں گے!!!

شکست کے بعد

کردار .. .. .. الف (قصبے کے لوگ)

میئر .. .. .. بریاں کے قصبے کا میئر۔ بوڑھا ہر دلعزیز

مادام .. .. .. میئر کی بیوی

ڈاکٹر .. .. .. میئر کا دوست

جان .. .. .. میئر کا ملازم

ربنی .. .. .. میئر کی ملازمہ

ہاریت .. .. .. کوئلے کی کان پر کام کرنے والا مزدور

لوئیزا .. .. .. ہاریت کی بیوی

جارج بارل .. .. قصبے کا سب سے امیر دکاندار

کردار .. .. .. ب (قصبے پر حملہ کرنیوالے لوگ)

کیپٹن تھائیلر .. .. دشمن کی فوج کا افسر

کرنل شافٹ .. .. دشمن کی فوج کا افسرِ اعلیٰ، پچھلی جنگِ عظیم کا تربیت یافتہ

کیپٹن ولیم .. .. .. نوجوان مشین کی طرح کام کرنیوالا، نظم ونسق کا خطرناک حد تک پابند

میجر .. .. .. فوجی انجنیئر

لفٹنٹ روشر .. ..
رسن برگ اور ٹائیٹل .. } تینوں نوجوان، نئے رنگروٹ ہیں، جنگ پہلی بار دیکھی ہے

شکست کے بعد کا واقعہ میں نے جان[1] سٹائن بک کے معروف ناول "مون[2] از ڈاؤن" سے لیا ہے، یہ ناول ان معدودے چند ادبی کارناموں میں سے ہے، جن کی تخلیق کی محرک موجودہ جنگ ہے اور جن کی ادبی حیثیت کو مستند مغربی نقادوں نے سراہا ہے۔ "مون از ڈاؤن" میں مصنف نے ہنگامی تاثرات سے بچ کر جنگ کے بنیادی مسائل سے بحث کی ہے اور انسانی جذبات کی اُن تہوں تک پہنچ جانا چاہا ہے۔ جو ہمیں صرف لاشعور میں اُبھرتے نظر آتے ہیں۔

اس تمثیل میں واقعات اور کردار کا تسلسل تقریباً وہی ہے جو آپ ناول میں پائیں گے۔ تقریباً اس لئے کہ چند جگہوں پر تصرف ناگزیر تھا۔ ڈرامائی اعتبار سے بھی اور فنی نقطہ نگاہ سے بھی۔ بہ حیثیتِ مجموعی میں نے یہ کوشش کی ہے کہ ناول کی روح اور اس کا مرکزی نصب العین اس ڈرامے میں پوری طرح اُجاگر رہے۔

جو واقعہ اس ڈرامے میں بیان کیا گیا ہے وہ سمندر کے کنارے ایک چھوٹے سے فرانسیسی قصبے کا ہے، جس پر دشمن نے حملہ کر کے قبضہ کر لیا ہے۔ اس قصبے کا نام بریاں ہے۔ لیکن اس کھیل میں یہ نام اتنا ضروری نہیں، یہ قصبہ، اس کے افراد، اس کے کردار، ہمارے اور آپ کے

[1] John Steindeck
[2] Moon Is Down

ملک کے بھی ہو سکتے ہیں۔ اور یہ ہو سکتا ہے کہ یہ ڈرامہ جسے آپ اس وقت محض تفننِ طبع کے لئے پڑھیں کبھی آپ کے قصبے یا شہر میں بھی کھیلا جائے۔

ایسے چھوٹے سے فرانسیسی قصبے کی پُر امن زندگی میں مدتوں سے ایسا ہنگامہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ لوگ حیرت سے بھونچکے رہ گئے ہیں اور سوچ نہیں سکتے کہ یہ سب کچھ کیونکر ہوا؟ اور کیسے ہوا؟ یہاں سیدھے سادے قصباتی لوگ بستے ہیں۔ دکاندار، چھوٹے موٹے زمیندار، دیہاتی اور مزدور جو سیاست کی پیچیدگیوں سے آگاہ نہیں۔ یہاں پولیس کے چند سپاہی تھے اور چند فوجی، جن میں سے کچھ تو ہلاک ہو چکے ہیں۔ اور باقی قید کر لئے گئے ہیں دشمن کے پانچویں کالم کی سرگرمیوں نے بریاں کے قصبے کو فتح کرنے میں بہت مدد دی ہے

اس شہر میں کوئلے کی ایک کان ہے، جس میں فرانسیسی مزدور کام کرتے ہیں۔ دشمن ظالم نہیں، جابر نہیں، وہ تو صرف یہ چاہتا ہے کہ پتھر کا کوئلہ اس کان میں سے نکلتا رہے۔ فرانسیسی مزدور کام کرتے رہیں۔ اور فرانسیسی جہازوں پہ لد کر دشمن کے ملک میں پہنچتا رہے۔ بس یہی ایک معمولی سا سوال ہے جس نے سب کو پریشان کر دیا ہے۔ دشمن کے فوجیوں کو، میئر کو، قصبے کے ڈاکٹر اور کان میں کام کرنیوالے مزدوروں کو اس ڈرامے میں اس معمولی سوال سے بحث کی گئی ہے۔

یہ ڈرامہ میئر کے مکان میں شروع ہوتا ہے۔ اور وہیں ختم ہوتا ہے۔ میئر کا مکان شاید اس ہارے ہوئے شہر کی روح کا مسکن ہے، چاروں طرف خاموشی ہے، اُداسی ہے، شکست ہو چکی ہے اور دشمن کی فوج کا کمانڈر میئر سے ملنے کے لئے آرہا ہے، اس مکان کے ڈرائنگ روم میں قصبے کا ڈاکٹر میئر کا ملازم جان اس کی آمد کے منتظر ہیں۔

ڈاکٹر۔ (دیا سلائی سے سگریٹ سلگاتا ہے) کرنل نے کس وقت آنے کو کہا تھا۔ جان!

جان۔ جی۔ پورے گیارہ بجے۔

ڈاکٹر۔ میئر کہاں ہیں۔

جان۔ لباس تبدیل کر رہے ہیں۔ مادام کا خیال ہے ڈاکٹر۔ کہ شہر کے میئر کو دشمن کے کمانڈر سے ملاقات کے وقت اچھے کپڑے پہننا چاہئیں۔ اور مادام..... اُم..... میئر کے کانوں میں اُگے ہوئے بالوں کے گچھے بھی قینچی سے کاٹ رہی ہیں

ڈاکٹر۔ پورے گیارہ بجے (دیوار پہ لگے ہوئے کلاک کو دیکھ کر) ہم۔ بس تو اب وہ آیا ہی چاہتے ہیں۔ یہ قوم وقت کی بہت پابند ہے۔

جان۔ اور مادام میئر کی گھنی بھویں بھی چھانٹ رہی ہیں۔ قینچی سے، لیکن میئر کا خیال ہے کہ اس سے انھیں بہت تکلیف ہوتی ہے۔ اور مادام میئر کو وہ سوٹ پہنا رہی ہیں جو میئر نے اپنے انتخاب کے روز پہنا تھا۔ (ہنستا ہے)

ڈاکٹر۔ (متانت سے) مادام کا سلیقہ قصبے بھر میں مشہور ہے، وہ یقیناً میئر کو اپنے

خاوند کو، دشمن کے سامنے اس طرح (رک کر) یہ کیسی آواز ہے جان؟

جان ۔ دشمن کا بینڈ ہے، پارک میں فتح اور خوشی کے نغمے سنا رہا ہے (ڈاکٹر چند لمحے اس موسیقی کو سنتا ہے)

ڈاکٹر ۔ گیارہ بجنے والے ہیں ۔ اب میئر تیار ہو کر آ جائیں تو اچھا ہو ۔ یہ قوم وقت کی بہت پابند ہے، ہر منٹ کے، ہر سیکنڈ کے کام کا اندازہ رکھتی ہے ۔

جان ۔ جی آپ بجا فرماتے ہیں ۔ گھڑی کی مشین کے پرزوں کی طرح کام کرتی ہے (قدموں کی آواز) لیجئے ۔ میئر اور مادام تشریف لے آئے ۔

میئر، مادام ۔ گڈ مارننگ ڈاکٹر ۔

ڈاکٹر ۔ گڈ مارننگ،

میئر ۔ کرنل شافٹ نہیں آئے؟

ڈاکٹر ۔ (کلاک کی طرف دیکھ کر) گیارہ بجنے میں دو منٹ باقی ہیں ۔

مادام ۔ جان! تم کمرے سے باہر گھنٹی کے قریب کھڑے رہنا ممکن ہے، تمہاری ضرورت پڑے ۔

جان ۔ بہت اچھا مادام ۔

مادام ۔ اور سنو ۔ جھک کر اور پردے سے کان لگا کر ہماری باتیں نہ سننا ۔ مجھے یہ گنوار حرکتیں پسند نہیں ۔

جان ۔ بہت اچھا مادام ۔ (دروازے کی طرف بڑھتا ہے)

مادام۔ اور سنو۔ جب تم سے کرنل شافٹ کو سگرٹ پیش کرنے کے لئے کہا جائے تو اپنے بوٹ کے تلے پر ماچس نہ رگڑنا۔ بلکہ ڈبیا پر لگے ہوئے مصالحے پر۔

جان۔ بہت بہتر مادام!

(جان مؤدب جھکتا ہے اور پھر کمرے کے باہر چلا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ہنستا ہے)

مادام۔ آپ کی کیا رائے ہے ڈاکٹر؟ ہمیں کرنل شافٹ کو سگرٹ کے علاوہ شراب بھی پیش کرنا چاہیئے۔ بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں مدت سے کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا اور مجھے معلوم نہیں کہ اس موقعہ پر صحیح آداب کیا ہوں گے اور پھر۔ دشمن نے ہمارے قصبے پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور ہمارے فوجی جان سے مارے گئے ہیں..... پھر بھی جنگ کے آداب؟

میئر۔ (جلدی سے) جنگ کے آداب نہ جانے کیا ہیں۔ مجھے تو کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ہاں اتنا ضرور محسوس کرتا ہوں کہ یہ جنگ ایک عجیب سی جنگ ہے۔ ہمیں اچھی طرح سے لڑنے کا موقع بھی نہ ملا۔ اور دشمن ہمارے گھر پر قابض ہو گئے۔ ڈاکٹر ایسی حالت میں کیا دشمن کو شراب پیش کرنی چاہیئے؟

مادام۔ میرے خیال میں تو کوئی ہرج نہیں ہمیں مصلحت سے کام لینا چاہیئے دشمن نے ہمیں شکست دے دی ہے۔

ڈاکٹر۔ مجھے جان نے بتایا کہ اُسے آپ کی خادمہ اپنی بتا رہی تھی کہ اسے آپکے ہمسائے کی باورچن بتا رہی تھی کہ قصبے کا تمباکو فروش بتا رہا تھا۔ کہ جب دشمن

ساحلی سڑک پر سے قصبے کی طرف آرہا تھا۔ تو ہمارے فوجیوں نے مزاحمت کی۔ کُل پچاس فوجی تھے، ان میں سے آٹھ مر گئے، دس پہاڑوں میں جا چھپے اور باقی قید کر لئے گئے۔ در اصل ہمارے فوجیوں کے پاس صرف پستول تھے۔ اور دشمن کے پاس مشین گنیں۔ ہمارے فوجی مسٹر بارل کی دعوت میں گئے ہوئے تھے۔ اور جب وہ واپس لوٹے۔ تو انہیں معلوم ہوا کسی نے فوجی بارود خانے اور میگزین کو ڈائنا میٹ سے اڑا دیا۔ اب وہ بیچارے خالی خولی پستولوں سے کیا لڑتے۔

میئر۔ مسٹر بارل؟ تمہارا مطلب ہے جارج بارل؟ ہمارا بساطی!

ڈاکٹر۔ ہاں، ہاں۔ وہی جارج بارل!

میئر۔ جارج بارل بہت اچھا آدمی ہے۔

ڈاکٹر۔ (طنز سے) بے حد نیک اور شریف۔

میئر۔ مجھے یاد ہے اس نے ہسپتال کی تعمیر میں ہماری کتنی مدد کی تھی۔

ڈاکٹر۔ (طنز سے) جارج بارل کی فیاضی نے ہمارے شہر کو بہت فائدہ پہنچایا ہے۔

جان۔ (اندر داخل ہو کر) کرنل شافٹ!

(ایک افسر اندر داخل ہوتا ہے۔ دشمن کا فوجی افسر
فربہ بدن۔ بڑی بڑی مونچھیں، نرم گفتار)

کیپٹن تھائیلر۔ گڈ مارننگ!

میئر۔ گڈ مارننگ! آپ کرنل شافٹ ہیں؟ (آگے بڑھتا ہے)

کیپٹن تھائیلر۔ نہیں، میں کیپٹن تھائیلر ہوں۔ کرنل صاحب ابھی آتے ہیں۔ معاف کیجئے گا۔ میں آپ حضرات کی جامہ تلاشی لینا چاہتا ہوں (ہنس کر) کوئی خطرناک اسلحہ جات۔ معاف کیجئے گا۔ یہ فوجی قاعدہ ہے (باتیں کرتا جاتا ہے اور جامہ تلاشی لیتا جاتا ہے) مادام۔ میں مجبور ہوں۔ جی ہاں آپ بھی ٹھیک ہے۔ سب ٹھیک ہے (ادھر اُدھر دیکھ کر) اس تکلیف کے لئے معافی چاہتا ہوں (ہنستا ہے) اور دروازے کی طرف بڑھتا ہے) وہ ابھی آتے ہیں۔ یہ لیجئے کرنل شافٹ! (سلوٹ کرتا ہے)

(کرنل شافٹ۔ میانہ قد، آنکھوں میں اک بے قرار حزیں چمک اطوار و گفتار میں تمکنت)

کرنل شافٹ۔ گڈ مارننگ!

میئر۔ گڈ مارننگ! **ڈاکٹر۔** آہُم (کھانستا ہے) **مادام۔** تشریف رکھئے	تینوں اکٹھے بولتے ہیں

کرنل۔ (خوش مزاجی سے) آپ تو یقیناً اس شہر کے میئر ہیں، اور آپ مادام، (ہنس کر) اس شہر کی ملکہ (مودب جھکتا ہے) اور آپ؟ (ڈاکٹر کی طرف

استفہامیہ انداز میں اشارہ کرتا ہے)

میئر۔ یہ ہمارے قصبے کے ڈاکٹر ہیں، اور اس کے مورخ بھی۔

کرنل۔ (ڈاکٹر سے) آپ کے قصبے کی تاریخ میں اب ایک اور صفحے کا اضافہ ہو جائے گا۔

ڈاکٹر۔ (دلجمعی سے) ایک نہیں بلکہ کئی ایک۔

جان۔ (دروازہ پر) جارج بارل!

(جارج بارل اندر داخل ہوتا ہے۔ پستہ قد، کوتاہ گردن فربہ اور جسیم، باریک پتلی آواز)

میئر۔ (مصافحہ کرتے ہوئے) ہیلو جارج!

بارل۔ معاف کیجئے گا۔ ذرا دیر ہو گئی۔

میئر۔ دیر؟

بارل۔ ہاں۔ مجھے دراصل کرنل کے ساتھ ہی آنا چاہیئے تھا۔

میئر۔ (پریشان ہو کر) کرنل کے ساتھ؟

کرنل فنافٹ۔ (میئر سے مخاطب ہو کر) انہیں جانتے تو ہوں گے یہ۔

ڈاکٹر۔ (جلدی سے قطع کلام کرتے ہوئے) یہ ہمارے دوست جارج بارل ہیں۔ ہمارے نیک دوست جارج بارل جنہوں نے اس شہر پر قبضہ کرنے کے لئے دشمن کا راستہ صاف کیا۔ ہمارے محب الوطن دوست جارج بارل جنہوں نے دشمن کے حملے کے روز ہمارے فوجی میگزین کو

ڈائنا میٹ سے اڑا دیا۔ تاکہ ہمارے سپاہی دشمن کا مقابلہ نہ کر سکیں، ہمارے پیارے جگری دوست جارج بارل جنہوں نے دشمن کو وہ فہرست بنا کر دی ہے جس سے دشمن کو پتہ چلا ہے کہ اس قصبے میں کس کس کے پاس کون سے اسلحہ جات ہیں اور کتنی تعداد میں (میئر سے انتہائی تلخی کے ساتھ) میئر صاحب! آپ انہیں نہیں جانتے؟ یہ ہیں ہمارے نیکو کار منیجر، سیٹھ، مسٹر جارج بارل!!!

جارج بارل۔ ہیں ——میں —— میں —— میرے خیالات آپ سے بہت مختلف ہیں، میں اپنی ضمیر، اپنے اعتقادات کے مطابق کام کرتا ہوں۔

میئر۔ (انتہائی حیرت اور پریشانی کے عالم میں بارل کی طرف دیکھ کر) جارج یہ سچ نہیں ہے، میرے دوست یہ سچ نہیں ہے (اس کے کوٹ کا کالر پکڑ کر) ہم دونوں ہمیشہ اکٹھے مل کر، کام کرتے رہے ہیں، تم نے میرے بیوی بچّوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا ہے۔ ایک میز پر شراب پی ہے۔ ہم دونوں نے اکٹھے شہر کا ہسپتال بنایا ہے۔ اس کا خوبصورت پارک، تیرنے کا تالاب، کنڈر گارٹن سکول، یقیناً یہ سچ نہیں ہے!

(جارج بارل کی طرف دیکھتا ہے جس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا ہے)

(چلّا کر) جارج؟

(اپنے آپ سے) جارج !...... (غصّے سے) کرنل شافٹ! میں اس آدمی کے سامنے کسی قسم کی گفتگو کرنے کو تیار نہیں ہوں! (وقفہ) جارج بارل تم فوراً کمرے سے باہر نکل جاؤ۔ نکل جاؤ!!

بارل۔ میں کرنل کے ساتھ ہوں!

مئیر۔ (کرنل سے) میں مسٹر جارج بارل کے سامنے کسی قسم کی گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔ کرنل!

(وقفہ)

کرنل۔ مسٹر بارل! کمرے سے باہر چلے جاؤ۔

بارل۔ لیکن میں نے بھی کام کیا ہے۔ میں نے بھی اس قصبے کو فتح کرنے میں مدد دی ہے۔ کیا ہوا اگر میں نے فوجی لباس نہیں پہن رکھا ہے۔

کرنل۔ مسٹر بارل۔ کیا تمہارا عہدہ مجھ سے بڑا ہے؟

بارل۔ یہ میں نے کب کہا ہے!

کرنل۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں۔ کمرے سے باہر چلے جاؤ

بارل۔ بہت اچھا۔ اگرچہ میں اس سلوک کو پسند نہیں کرتا۔

(تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے جارج بارل کمرے سے باہر چلا جاتا ہے)

ڈاکٹر۔ (طنزیہ) آج میری تاریخ میں ایک بہت اچھے باب کا اضافہ ہوا ہے۔

کرنل۔ (کھانس کر) آ ۔۔۔ ہُم۔

میئر۔ (کرنل سے) فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ آپ بیٹھ جایئے اس کرسی پر۔

کرنل۔ شکریہ (سب لوگ کرسیوں اور صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں) میئر صاحب جنگی مجبوریوں سے قطع نظر میں آپ لوگوں سے دوستانہ تعلقات رکھنا چاہتا ہوں، میں ایک فوجی انجنیئر ہوں، میرا کام یہ ہے، کہ اس قصبے کی کان کا کوئلہ اپنے ملک کو مہیا کرتا رہوں، آپ بدستور میئر رہیئے۔ شہر کے اندرونی انتظامات میں میرا کوئی دخل نہ ہوگا

میئر۔ آس پاس کے علاقے میں سے مزاحمت کی کوئی خبر آئی۔

کرنل۔ تار، ٹیلیفون تو ہم نے پہلے ہی ختم کر دیئے تھے۔ ہمارے بندوبست کے مطابق سب کام نہایت خوش اسلوبی سے ہوا۔ ہر جگہ ہمارا قبضہ ہو گیا ہے مزاحمت ہوئی، لیکن بے کار تھی۔ ہمارا بندوبست بہت اچھا تھا۔

میئر۔ لیکن لوگوں نے مزاحمت کی۔

کرنل۔ ہاں تھوڑا سا خون خرابہ ہوا۔ لیکن ہم نے جلد قابو پا لیا۔ یہ ان کا احمقانہ فعل تھا۔ مشین گنوں کے مقابلے پر نہتے لوگ کیا کر سکتے ہیں۔

میئر۔ وہ بے شک احمق تھے۔ لیکن انہوں نے مزاحمت تو کی!

کرنل۔ مجھے ان کی بے وقوفی پر افسوس ہے۔

میئر۔ ہاں یہ ایک بیوقوفی ہوگی۔ آپ کو افسوس بھی ہوگا، لیکن غور کیجئے کہ ان

لوگوں نے مزاحمت ضرور کی۔

کرنل۔ (قدرے تلخی سے) مجھے کوئلہ چاہیئے۔ میں مزید مزاحمت نہیں چاہتا، مزید خون خرابہ نہیں چاہتا۔ اس میں آپ ہی کا نقصان ہے۔ اچھی طرح سوچ لیجئے۔ میری تجویز یہ ہے کہ آپ ہماری مدد کریں۔ سب سے اوّل تو یہ ہوگا کہ میں اور میرا اسٹاف آپ کے ہاں مہمان رہیں گے۔

میئر۔ یہ مکان بہت چھوٹا ہے۔ آپ کو تکلیف ہوگی۔ آپ کسی دوسری جگہ۔

کرنل۔ نہیں، نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ میں آپ کے ہاں رہوں گا۔ تو ذرا آسانی ہوگی۔

میئر۔ لوگ سمجھیں گے کہ میئر اور کرنل میں کوئی سمجھوتہ ہوا ہے!

کرنل۔ اس سے کام کرنے میں ذرا آسانی ہو جاتی ہے۔ اور پھر آپ سے گاہے گاہے مشورہ بھی ہوتا رہے گا۔

میئر۔ (گھبرا کر) میں کوئی مشورہ نہیں دے سکتا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

کرنل۔ آپ میئر ہیں۔ اس شہر کے سردار ہیں۔ ہم ہمیشہ وہی کرتے ہیں جو ہمارا سردار کہتا ہے۔

میئر۔ (بھولپن سے) ہمارے ہاں سردار وہی کرتا ہے جو شہر کے لوگ کہتے ہیں کرنل صاحب ہمارا نظامِ زندگی آپ سے بہت مختلف ہے۔ مجھے کچھ پتہ

نہیں کیا چاہتا ہے ؟

ڈاکٹر۔ میٔر کی روح اس شہر میں گھلی ہوئی ہے۔ میٔر نہیں جانتا وہ کیا کرے جب تک شہر کے لوگ ـــــ

کرنل۔ (قطع کلام کرتے ہوئے) میٔر خود سوچ کر فیصلہ کر سکتا ہے۔ اُسے دوسروں سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔

ڈاکٹر۔ میٔر اپنے لئے سوچ سکتا ہے، دوسروں کے لئے نہیں، یہ طریقہ آپ کے ہاں رائج ہوگا۔ ہمارے ہاں نہیں۔

میٔر۔ اگر میں آپ کو یہاں جگہ دینے سے انکار کر دوں تو ـــــ ؟

کرنل۔ (سر ہلا کر) مجھے افسوس ہے۔ میں آپ کو ایسا کرنے کی اجازت نہ دونگا۔

(باہر سے شور و غل سنائی دیتا ہے)

میٔر۔ تو پھر آپ مجھ سے پوچھتے ہی کیوں ہیں۔ بے کار تماشہ!

(شور و غل بند ہو جاتا ہے)

ڈاکٹر۔ یہ کیسا شور ہے ؟

جان۔ (اندر داخل ہوتا ہے) حضور اینی بہت خفا ہے (کرنل کی طرف اشارہ کر کے) آپ کے سپاہی مکان کے باہر کھڑے ہیں۔ اور مکان کے اندر بھی موجود ہیں۔ اینی انھیں مطلق پسند نہیں کرتی۔

کرنل۔ معمولی بات ہے۔ میری گارد میرے ساتھ آئی ہے (میٔر سے) یہ اینی

کون ہے؟

مادام۔ ہماری باورچن ہے۔

جان۔ (میئر سے) اور حضور اینی نے غصے میں آکر کھولتا ہوا گرم پانی ان سپاہیوں پر پھینک دیا ہے۔ اور وہ لوگ چلا رہے ہیں۔

کرنل۔ کسی کو چوٹ تو نہیں آئی۔

جان۔ جی چوٹ تو نہیں آئی۔ البتہ دو ایک کا منہ جل گیا ہے۔ ایک سپاہی کے گنجے سر پر آبلے پڑ گئے ہیں۔ اور ایک سپاہی کو اینی نے کاٹ کھایا ہے جو اسے گالیاں دے رہا تھا۔

کرنل۔ میرے خیال میں اینی کو گرفتار کر لیا جائے۔

میئر۔ تو پھر آپ کو کھانا نہیں ملے گا۔ اینی بہت اچھی باورچن ہے۔ بے حد لذیذ کھانا پکاتی ہے۔

مادام۔ (اُٹھ کر باہر جاتے ہوئے) میں دیکھتی ہوں سپاہی اینی سے جھگڑا نہ کریں۔

کرنل۔ (کچھ سوچ کر) کیپٹن تھائیلر! سپاہیوں کو حکم دو کہ مکان کے ہال اور پورچ سے باہر چلے جائیں۔

کیپٹن تھائیلر۔ بہت بہتر (باہر چلا جاتا ہے)

ڈاکٹر۔ (کرنل کو سگریٹ پیش کرتے ہوئے) میری تاریخ کا ایک صفحہ تو پورا ہو گیا کرنل صاحب

کرنل۔ (کھانستے ہوئے) آ ــ آ ــ ہُم!

منظر دوم

میئر کے گھر کے بڑے ہال کو فوجی افسروں کے رہنے کے لئے خالی کر دیا گیا۔ ہال کے اندر داخل ہوتے ہی جس چیز پہ پہلے نظر پڑتی ہے، وہ لکڑی اور پردے کے امتزاج سے بنی ہوئی کیبن کی ایک قطار ہے، جو ہال کی شمالی دیوار سے لے کر جنوبی دیوار تک چلی گئی ہے۔ ان کیبن نما کمروں ہی میں دشمن کے فوجی افسر رہتے ہیں۔ ان کے باہر کھانے کی میز ہے، تاش کھیلنے کی میز ہے ایک طرف میجر لکڑی کے تختے پر کسی پُل کا نقشہ بنا رہا ہے کیپٹن ولیم باقاعدہ وردی میں ملبوس اس کے قریب کھڑا ہے۔

کیپٹن ولیم: یہ کس پُل کی تصویر کھینچ رہے ہیں آپ۔

میجر۔ (نقشہ بناتے ہوئے سر اٹھائے بغیر) کوٹلے کی کان کے قریب جو ریل کا پُل تھا اسے دوبارہ تعمیر کیا جائے گا۔

ولیم۔ میجر (رک کر) میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔

میجر۔ ہوں — ہوں

ولیم۔ کیپٹن فرٹز کی آج کوٹلے کی کان پر ڈیوٹی تھی وہ وہاں پر غیر فوجی ٹوپی پہنے[1]

[1] Fatigue Cap

ہوئے چلا گیا۔

میجر۔ تو پھر کیا ہوا ولیم؟

ولیم۔ ہم دشمن کے ملک میں ہیں، ہمیں احتیاط لازم ہے۔ ملٹری مینوئیل کی دفعہ نو کے مطابق۔

میجر۔ کیپٹن ولیم تمہارے دل میں بے بنیاد شبہات پیدا ہو رہے ہیں مجھے تو یہاں کے لوگ سیدھے سادے پرامن شہری دکھائی دیتے ہیں۔

ولیم۔ لیکن پھر بھی ملٹری مینوئیل کی دفعہ نو کے مطابق۔

میجر۔ (آواز دیتے ہوئے) لفٹننٹ روشر!

(ایک کیبن میں سے لفٹننٹ روشر جلدی باہر جھانکتا ہے چہرے پر صابن کا جھاگ لگا ہوا ہے۔ پردہ ہٹا کر اُٹھ کر میجر کے پاس آ کر کھڑا ہو جاتا ہے)

لفٹننٹ روشر۔ یس میجر!

میجر: یہ سٹول ذرا کھسکا دو۔ تصویر پر روشنی زیادہ پڑ رہی ہے۔

روشر۔ (کھسکاتے ہوئے) یس میجر۔

ولیم۔ لفٹننٹ روشر!!

روشر۔ یس کیپٹن ولیم!

ولیم۔ تمہارے چہرے پر صابن کا جھاگ لگا ہوا ہے۔

روشر۔ میں اپنی ڈاڑھی مونڈ رہا تھا۔

ولیم۔ (ڈپٹ کر) اور تمہارے کوٹ کے بٹن بھی کھلے ہوئے ہیں۔

روشر۔ یس — ار — ار سونے کی تیاری کر رہا تھا۔

ولیم۔ کوٹ کے بٹن بند کرو۔ بڑے افسروں کے سامنے اس حالت میں؟ کیا تم نے ملٹری مینوئیل کی دفعہ سات کا مطالعہ نہیں کیا؟

روشر۔ کوٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے) یس کیپٹن ولیم۔ معافی چاہتا ہوں۔

کرنل شافٹ۔ (اندر داخل ہوتے ہوئے) کیا بات ہے میجر؟ (سب کھڑے ہو جاتے ہیں) ہلو، کیپٹن ولیم (ہنستے ہوئے) ملٹری مینوئیل پر لیکچر ہو رہا ہے۔

میجر۔ (جھکے ہوئے انداز میں) یہ کیپٹن ولیم بے چارے روشر پر خفا ہو رہے تھے۔

کرنل۔ کیپٹن ولیم۔

ولیم۔ یس کرنل۔

کرنل۔ کرنل فرٹز آج صبح سے کوئلے کی کان پر ڈیوٹی دے رہا تھا۔ اس کی طبیعت ناساز ہے۔ تم اس کی جگہ پر چلے جاؤ۔

ولیم۔ بہت اچھا کرنل۔

(ولیم چلا جاتا ہے)

کرنل۔ (بیٹھتے ہوئے) یہ لونڈا ولیم ایک دن جنرل ہیڈ کوارٹر میں ہوگا۔

میجر۔ وہ کیسے؟

کرنل۔ ملٹری کے آداب جتنے اسے آتے ہیں شاید بڑے بڑے جرنیلوں کو بھی یاد نہ ہوں گے۔ اور پھر بے وقوف بھی ہے۔

میجر۔ ہاں بالکل گدھا ہے۔ اسی لئے تو —

کرنل۔ میجر یہ کس کا نقشہ ہے۔

میجر۔ ریل کا نیا پل۔

کرنل۔ آ — آ — آ — ہُم

میجر۔ کرنل یہ جنگ کب ختم ہوگی۔

کرنل۔ جب ہمارے دشمن ختم ہو جائیں گے۔

میجر۔ لیکن اب تو ہم نے سارے یورپ پر قبضہ کر لیا ہے۔ اب ہمارا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔

کرنل۔ ابھی دشمن باقی ہیں۔

لفٹننٹ روشر۔ تو کیا جنگ امسال ختم نہ ہوگی۔

کرنل۔ کیوں لفٹننٹ روشر کیا بات ہے؟

روشر۔ میں اور آئیٹل سوچ رہے تھے۔ کہ اگر جنگ امسال ختم ہو جائے تو ہم یہیں رہ جائیں۔ یہ جگہ اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اس وادی میں

ہم نے ایک بڑی پُر فضا جگہ دیکھی ہے۔ چاہتے ہیں، ہم وہاں ایک فارم بنا لیں اور چین سے رہیں۔

کرنل۔ گھر کی زمین کیا ہوئی۔

روشن۔ وہ تھوڑی سی تھی۔ قرضے میں بک گئی۔

کرنل۔ ہُم۔

روشن۔ اور کرنل صاحب میں اور آئیٹل سوچ رہے تھے۔ کہ ان کی کرسمس میں اگر ہمیں فرلو مل جائے تو ـــ

کرنل۔ کرسمس تو آنے دو ابھی بہت سا کام باقی ہے۔

(ایک نوجوان لفٹننٹ اندر داخل ہوتا ہے)

کرنل۔ آئیٹل کیا بات ہے!

لفٹننٹ آئیٹل۔ (سلیوٹ کرتے ہوئے) مسٹر بارل آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

کرنل۔ انہیں اندر بھیج دو۔

(آئیٹل واپس چلا جاتا ہے۔ بارل اندر داخل ہوتا ہے سر پہ پٹی بندھی ہے)

کرنل۔ کیا بات ہے بارل، یہ تم نے سر پہ پٹی کیسے باندھ رکھی ہے؟

بارل۔ میں کوئلے کی کان کے قریب سے گذر رہا تھا۔ کہ پہاڑ کی گھاٹی پر سے

ایک چھوٹا سا پتھر لڑھکتا ہوا آیا۔ اتفاقیہ طور پر لگ گیا۔

کرنل۔ تمہیں یقین ہے کہ یہ امر اتفاقیہ تھا؟

بارل۔ بالکل۔ میں ان لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہوں، یہ سب میرے دوست ہیں۔ یہاں میں نے زمین خرید لی ہے۔ مکان بنایا ہے۔ ایک خوبصورت لڑکی میری نوکرانی ہے۔ میرا خیال ہے وہ مجھ سے محبت بھی کرتی ہے

کرنل۔ (گہری سنجیدگی اور متانت سے) میری بات سنو۔ بارل، اب تم اس قصبے سے چلے جاؤ۔ تو بہتر ہے۔ یہ لوگ اب تمہیں —— پسند نہ کریں گے، وہ سمجھتے ہیں کہ تم نے —— انہیں دھوکا دیا ہے۔ ان کی نظروں میں تم ایک غدار ہو —— تم نے ہماری مدد کی ہے، ہمارے لئے بہت اچھا کام کیا ہے۔ میں نے اپنی رپورٹ میں تمہارے کام کو بیحد سراہا ہے، لیکن —— اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ یہاں اب تمہارا زیادہ دیر ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں۔

بارل لیکن میں تو یہ کہنے آیا تھا۔ کہ مئیر کی جگہ مجھے شہر کا منتظم بنا دیا جائے

کرنل۔ غدار سے لوگ کیسے تعاون کریں گے!

بارل۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ لیڈر کے الفاظ نہیں ہیں۔

کرنل۔ مسٹر بارل میں آپ کو نیک صلاح دے رہا ہوں، آپ یہاں سے چلے جائیے۔ میں اس کا ابھی بندوبست کئے دیتا ہوں، اور سنئے۔

جہاں تک ہو سکے گھر سے باہر نہ نکلیے۔ فوجی ٹوپی پہنیے۔ اور کسی عورت کا اعتبار نہ کیجیے۔

بارل ۔ میں میئر بننا چاہتا ہوں۔

کرنل ۔ میں آپ کو میئر نہیں بنا سکتا۔ آپ کی افادی حیثیت اب اس قصبے میں صفر کے برابر ہے، جو میئر ہے، وہی میئر رہے گا۔ وہ یہاں کے لوگوں کا نمائندہ ہے۔ گو میں اس پر کڑی نگاہ رکھتا ہوں۔ لیکن اس کی حرکات و سکنات کو دیکھ کر مجھے ہر وقت یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اب اس ملک کے لوگ کیا سوچ رہے ہیں۔ کیا کر رہے ہیں، کس بات کی تیاری کر رہے ہیں۔ میئر اس قوم، اس ملک کی روح کا مظہر ہے۔ میں اس کے قریب رہنا چاہتا ہوں تاکہ آنے والے خطرے کو دیکھ کر پیش بندی کر سکوں۔

بارل ۔ میں میئر بننا چاہتا ہوں، میں یہاں سے نہیں جانا چاہتا۔ میں نے یہاں کام کیا ہے۔ مجھے اس کا صلہ ملنا چاہیے۔ میں نے ہیڈ کوارٹرز کو اس امر کا ایک خط بھیجا ہے، میں ان کے جواب کا انتظار کروں گا۔

کرنل ۔ جو جی میں آئے کرو۔ لیکن میں تمہیں متنبہ کیے دیتا ہوں مسٹر بارل، تمہاری زندگی خطرے میں ہے، لوگ تم سے نفرت کرتے ہیں، یہ ہمارا ملک نہیں ہے، ہم نے اس پر قبضہ کیا ہے۔ اس امر کو یاد رکھو غاصب سے سب ڈرتے ہیں، لیکن غاصب کو کوئی پیار نہیں کرتا۔

بارل۔ لیکن ہم نے انہیں شکست دیدی ہے۔

کرنل۔ شکست ایک وقتی چیز ہے، یہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی، پچھلی جنگ میں ہم نے شکست کھائی تھی۔ آج ہم پھر عروج پر ہیں، شکست کا اعتبار کیا؟ تمہیں معلوم ہے۔ لوگ اپنے بند کمروں میں شاید کسی نئی بغاوت کے آغاز کی تیاری کر رہے ہیں۔

بارل۔ کیا آپ بغاوت سے ڈرتے ہیں کرنل۔

کرنل۔ (تھکے ہوئے لہجے میں) میں صرف ان لوگوں سے ڈرتا ہوں، جو جنگ کا تجربہ حاصل کئے بغیر جنگ کے ماہر بن جاتے ہیں۔ مجھے یاد ہے، برسلز میں ایک بار پچھلی جنگِ عظیم میں میرا واسطہ بلجیم کی ایک بوڑھی عورت سے پڑا تھا، (خوابیدہ لہجے میں) معصوم اداس سا چہرہ، سفید بال، چھوٹے چھوٹے ملائم ہات، جن پر نیلی رگیں اُبھری ہوئی نظر آتی تھیں، وہ اکثر ہماری بارک میں آیا کرتی، ہمیں ہمارا قومی ترانہ سنایا کرتی، اپنی بوڑھی لرزتی ہوئی میٹھی آواز میں، وہ ہمارے مختلف کام کیا کرتی۔ سیگرٹیں ہوں یا عورتیں وہ ہماری ہر ضرورت پوری کر دیا کرتی، (وقفہ) ہمیں معلوم نہ تھا کہ یہ وہی بوڑھیا تھی کہ جس کے اکلوتے بیٹے کو ہم نے پھانسی پر لٹکا دیا تھا۔ آخر جب ہم نے اس بڑھیا کو گولی کا نشانہ بنایا وہ اس وقت ہمارے بارہ افسروں کو ہلاک کر چکی تھی، لوہے کی ایک بڑی سوئی سے، جانتے ہو

پستول کی گولی یا مشین گن سے نہیں، ایک لوہے کی معمولی سوئی سے جسے
وہ ہمیشہ اپنی ٹوپی میں لگائے رکھتی، وہ سوئی اب بھی میرے پاس ہے، اس
کے وسط میں سیپ کا بٹن لگا ہوا ہے جس پر بلبل کی تصویر بنی ہوئی ہے
..... یہ دیکھو!

بارل۔ تو آپ نے اسے گولی مار دی۔

کرنل۔ ہاں۔

بارل۔ اور پھر یہ شورشہ ختم ہو گیا ہو گا۔ پھر تو افسروں پر کسی نے حملہ نہ کیا ہو گا۔

کرنل۔ بڑھیا مار ڈالی گئی۔ لیکن اس سے حملے ختم ہوتے، حملے بڑھتے گئے
قتل و غارت، انتقام،

بارل۔ کیا آپ اپنے جونیر افسروں کے سامنے بھی ایسی باتیں کرتے ہیں۔

کرنل۔ نہیں وہ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔

بارل۔ کرنل صاحب آپ کو ایسی مہم کا افسر نہیں ہونا چاہیئے تھا۔

کرنل۔ میں کم از کم تمہاری طرح بے وقوف نہیں، میں حالات کا مشاہدہ کرتا ہوں
اور اس لیئے غلطی بھی کم کرتا ہوں۔ مسٹر بارل تمہارا کام یہاں ختم ہو چکا ہے
میں تمہاری سفارش کروں گا۔ تمہیں کسی دوسرے شہر میں بھیج دیا جائے گا۔
کسی بڑے شہر میں جہاں تم ازسرِ نو اپنا کام شروع کر سکو، نئے تعلقات پیدا
کر سکو، نئی فتوحات!

(کیپٹن ولیم جلدی سے اندر داخل ہوتا ہے)

کرنل۔ کیا بات ہے کیپٹن ولیم!

ولیم۔ حضور کیپٹن فرٹز کو ایک فرانسیسی مزدور ہاریت نے چھرا مار کر ہلاک کر دیا ہے، وہ دراصل مجھ پر حملہ کرنا چاہتا تھا، کہ کیپٹن فرٹز مجھے بچانے کے لئے آگے بڑھا

کرنل۔ (آہستہ سے) آ۔۔۔ ہُم، یہ مصیبت پھر شروع ہو گئی۔

ولیم۔ حضور کیا فرمایا آپ نے۔

کرنل۔ کچھ نہیں، (وقفہ) میئر صاحب کو ہمارا سلام کہو، بولو کرنل صاحب ابھی ملنا چاہتے ہیں۔

ولیم۔ یس سر!

(ولیم جلدی سے باہر نکل جاتا ہے۔ کرنل سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے)

منظرِ سوم

(میئر کے طعام کا کمرہ اینی اور جان ایک گوشے میں
رکھی ہوئی بھاری میز کو سرکا رہے ہیں)

اینی۔ جان، دیکھنا، کہیں اس کا پایہ نہ نکل جائے۔

جان۔ بہت پرانی میز ہے۔ اینی۔

اینی۔ یہ لوگ اس بڑی میز کو یہاں کیوں رکھنا چاہتے ہیں۔

جان۔ لوئیزا کے خاوند ہاریت نے کیپٹن فرٹز کو چھرا مار دیا تھا۔ آج اس کا کورٹ مارشل ہوگا۔

اینی۔ اس کمرے میں؟

جان۔ اسی کمرے میں!

اینی۔ اور میئر؟

جان۔ مجبور ہے!

اینی۔ لیکن لوگ اسے برداشت نہ کریں گے (وقفہ) میں اسے برداشت نہیں کرسکتی۔

جان۔ تم کیا کروگی؟

اینی - میں چار پانچ بدمعاشوں کو جان سے مار کر رہوں گی۔

(قدموں کی آواز)

جان - ہش - میئر آ رہے ہیں -

- ڈاکٹر بھی ساتھ ہے (وقفہ) ارے لوئیزا بھی ہے - یہ یہاں کیسے آئی،
کیوں آئی ہے؟ کتنی پیاری لڑکی ہے، بے چاری لوئیزا -

(میئر، ڈاکٹر اور لوئیزا کا داخلہ، لوئیزا نوجوان طرح دار عورت ہے - بڑی بڑی آنکھوں میں حزن و ملال)

میئر - لوگ کیا کہتے ہیں لوئیزا -

لوئیزا - لوگ کہتے ہیں میئر، کہ دشمن کی فوج کے ایک کپتان کو قتل کرنے کے جرم میں جو سزا میرے خاوند کو ملے گی - وہ آپ کے حکم سے دی جائیگی -

میئر - لوگ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں (پریشانی کے عالم میں) میں یہ کام کیسے کر سکتا ہوں، ڈاکٹر، لوگوں کا اعتبار مجھ پر نہیں رہا - دشمن بھی مجھ پر بھروسہ نہیں کرتا - اب میں کیا کروں؟

اینی - لوئیزا کے خاوند نے کوئی گناہ نہیں کیا، حضور، سارا شہر جانتا ہے، وہ بے حد شریف ہے -

جان ۔ حضور ہاریت کا باپ اس قصبے کی میونسپلٹی کا ممبر رہ چکا ہے۔

اینی ۔ (ملتجیانہ انداز میں) اس نے لوئیزا کو پچھلی کرسمس پر ایک سرخ ریشمیں گاؤن دیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

(لوئیزا کی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگتے ہیں، جان باہر چلا جاتا ہے)

میئر ۔ لیکن تم سے کس نے کہا کہ میں اسے سزا دینا چاہتا ہوں۔ میں اسے سزا کیوں دوں، اس نے اپنے ملک، اپنی قوم کے خلاف کوئی کام نہیں کیا۔

لوئیزا ۔ میئر! کیا وہ —— وہ —— کیا وہ میرے خاوند کو گولی سے ہلاک کر دیں گے۔

(میئر کو خاموش دیکھ کر لوئیزا سسکیاں لینے لگتی ہے)

میئر ۔ میری بچی۔ لوئیزا ۔ میری بچی۔

لوئیزا ۔ (یکایک) مجھے نہ چھوؤ۔ مجھے مت چھوؤ..... —— میں جاتی ہوں۔

(تیز تیز قدموں سے باہر چلی جاتی ہے)

میئر ۔ (پریشان ہوکر) جان! اینی! ۔ ارے ۔ مادام کو جلد بلا لاؤ۔

جان ۔ کرنل آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

(میئر اثبات میں سر ہلاتا ہے۔ جان باہر جاتا ہے کرنل اندر داخل ہوتا ہے)

کرنل۔ میں چاہتا ہوں آپ خود ہاریت کو موت کی سزا دیں۔ اس نے کیپٹن فرٹز کو قتل کر دیا ہے۔ آپ یقیناً سارا واقعہ سُن چکے ہیں۔

میئر۔ (ان سُنی کر کے) ہاریت کہاں ہے کرنل۔

کرنل۔ اسے ہم نے گرفتار کر لیا ہے۔ ابھی یہاں حاضر کیا جائے گا۔

میئر۔ میں ہاریت کو موت کی سزا نہیں دے سکتا۔

کرنل۔ کیوں؟

میئر۔ میں اس شہر کا میئر ہوں، اپنے ملک کے قانون کے مطابق مجھے موت کی سزا دینے کا اختیار نہیں ہے، لیکن مجھ سے یہ بات کیوں کہی جا رہی ہے، تم جانتے ہو میرے اختیار میں اب کچھ نہیں ہے۔

کرنل۔ اگر سزا آپ کی طرف سے دی جائے گی، تو لوگوں پر اس کا خاطر خواہ اثر پڑے گا، امن ہو جائے گا۔ مجھے زیادہ آدمی قتل نہ کرنے پڑیں گے۔ آپ لوگوں کو زیادہ تکلیف نہ ہو گی ——— جو شخص قتل کرتا ہے۔ اُسے موت کی سزا ملنی چاہیئے۔ قانون بھی یہی کہتا ہے۔

میئر۔ میں ہاریت کو ایک شرط پر موت کی سزا دے سکتا ہوں (وقفہ) اور وہ شرط یہ ہے۔ کہ آپ بھی ان لوگوں کو موت کی سزا دیں۔ جنہوں نے ہمارے سپاہیوں کو ہمارے قصبے پر حملہ کرتے وقت جان سے مار ڈالا تھا۔

کرنل۔ آپ مذاق کر رہے ہیں۔

میئر۔ یہ مذاق نہیں ہے۔ مذاق تو آپ کر رہے ہیں۔ آپ ہمارے قصبے پر حملہ کرتے ہیں۔ ہمارے سپاہی جان سے مارے جاتے ہیں۔ یہ اگر قتل نہیں تو کیا ہے۔ اس کی سزا موت نہیں تو کیا ہو گی۔ قانون؟ کس قانون کا آپ ذکر کر رہے ہیں۔ آپ اور ہمارے درمیان اب قانون کیسا؟ اب تو صرف ایک قانون رہ گیا ہے، جنگ کا قانون! یا آپ ہمیں ختم کر دیں گے یا ہم آپ کو ختم کر دیں گے۔ یہ قطعی ہے۔

کرنل۔ (مسکرا کر) کیا میں اس کرسی پر بیٹھ سکتا ہوں۔

میئر۔ یہ ایک اور جھوٹ ہے، کیا میں اس کرسی پر بیٹھ سکتا ہوں! آپ کیوں مجھ سے پوچھتے ہیں، میں کون ہوں؟ آپ چاہیں تو مجھے یہاں گھنٹوں کھڑا رکھ سکتے ہیں۔ اس مذاق کی کیا حاجت ہے؟

کرنل۔ میں آپ کی مدد چاہتا ہوں۔

میئر۔ دشمن کی مدد دشمن نہیں کر سکتا۔ ہمارے اور آپ کے درمیان اب ایک نیا رشتہ ہے، حاکم و محکوم کا رشتہ، آقا و غلام کا رشتہ، سرپرستی و نفرت کا رشتہ اس نئے قانون کی زنجیریں سارے فرانس میں پھیلتی جا رہی ہیں۔ میری قوم کی زخمی رُوح میں انتقام کا جذبہ استوار کر رہی ہیں۔ میں خود مر سکتا ہوں، لیکن حریت کو موت کی سزا نہیں دے سکتا!

کرنل۔ (سگرٹ سلگاتے ہوئے) ہوں۔ (وقفہ) میرا خیال ہے کہ اب بارل کو میئر بنانا ہی پڑے گا۔ (وقفہ) اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ (وقفہ) آپ کورٹ مارشل کے وقت تو یہاں ہوں گے؟

میئر۔ ہاں رہنا چاہتا ہوں، تاکہ بدبخت ہاریت کی تسلّی و تشفی کر سکوں!

کرنل۔ ایک بار پھر سوچ لیجئے۔ میئر صاحب (سختی سے) میں چاہتا تھا یہ خون خرابہ پھر شروع نہ ہو۔

(میئر رخ موڑ کر ایک بڑی کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہوتا ہے اور باہر دیکھنے لگتا ہے)

میئر۔ (لہجے سے سب غصہ غائب ہو چکا ہے) باہر برف پڑ رہی ہے کرنل صاحب (وقفہ) کرنل کی طرف مڑ کر) ذرا اس کھڑکی میں سے جھانکئے؟ کیسی سپید، پیاری، خوشگوار برف ہے۔

(کرنل ہونٹ چبانے لگتا ہے پھر اٹھ کر کھڑکی کی طرف بڑھتا ہے)

منظرِ چہارم

وہی کمرہ جو منظرِ سوم میں تھا۔ لیکن اب اسے ایک فوجی عدالت کے کمرے کی صورت میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ جب پردہ اُٹھتا ہے، تو ہاریت کا کورٹ مارشل ہو رہا ہے۔ اور کیپٹن ولیم ہاریت کے خلاف فردِ جرم پڑھ رہا ہے۔

کیپٹن ولیم۔ (پڑھتے ہوئے) اس پر بھی ہاریت نے کوئی پروا نہ کی اور صاف انکار کر دیا۔ اور پھر جب ہاریت کو کوئلے کی کان میں کام کرنے کا حکم دیا گیا تو ہاریت نے آگے بڑھ کر کیپٹن ولیم پر حملہ کرنا چاہا۔ کیپٹن فرٹز نے بیچ میں آ کر اسے بچانا چاہا اور چھرا اس کی چھاتی کے پار ہو گیا۔ (رک کر) ڈاکٹر کی رائے اس رپورٹ کے ساتھ منسلک ہے، کیا آپ اسے بھی سننا پسند کریں گے۔

کرنل۔ (جو صدرِ عدالت ہے) نہیں، نہیں، جلد اس قصے کو ختم کرو۔

ولیم۔ (پڑھتے ہوئے) یہ سارا واقعہ بہت سے سپاہیوں کے سامنے پیش آیا، ان کی شہادتیں بھی یہاں مرقوم ہیں۔ (رک کر) اس ملٹری کورٹ کا فیصلہ ہے کہ ہاریت کیپٹن فرٹنر کے قتل کا مرتکب ہؤا ہے۔ لہذا اسے موت کی سزا دی جاتی ہے' (وقفہ) سپاہیوں کی شہادتیں بھی پڑھوں؟

کرنل۔ نہیں، ولیم، اس کی ضرورت نہیں (ہاریت سے) ہاریت تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو۔

میئر۔ ہاریت اسی کرسی پر بیٹھ جاؤ۔

ولیم۔ فوجی عدالت میں اسے کرسی پر بیٹھنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

کرنل۔ نہیں، بیٹھ جانے دو، کوئی ہرج نہیں ہے۔

میئر۔ ہاریت ادھر آؤ۔ میرے قریب بیٹھ جاؤ۔ کہو۔ جو کچھ تمہیں اپنی صفائی میں کہنا ہے۔

ہاریت۔ میں ـــــ میں ـــــ صرف یہ کہنا چاہتا ہوں۔ کہ میں نے رنج اور غصے میں آکر یہ کام کیا ہے۔ میں اسے مارنا نہ چاہتا تھا، مجھے کوئلے کی کان پر کام کرنے کے لئے مجبور کیا گیا، میں غصے سے پاگل ہو رہا تھا اور میں نے ـــ میں آزاد طبیعت کا مالک ہوں۔ میں تنک مزاج بھی ہوں۔ میں کبھی کسی کا غلام نہیں رہا۔ میں اس طرح کے حکم نہیں مان سکتا۔ میں اسے مارنا نہ چاہتا تھا۔ وہ تو یوں ہی بیچ میں آگیا۔ میں دراصل کیپٹن ولیم کو مارنا چاہتا تھا۔

کرنل۔ اس سے کوئی بحث نہیں کہ تم کسے قتل کرنا چاہتے تھے۔ یہ بتاؤ تمہیں اپنی حرکت پر افسوس ہے۔

ہاریت۔ قطعی نہیں۔

کرنل۔ اگر اس جرم کی سزا موت ہو۔ تب بھی نہیں۔

ہاریت۔ جب بھی نہیں، میں غلام نہیں رہنا چاہتا۔

کرنل۔ بس اور کہنے کی ضرورت نہیں، تمہارا جرم صاف ظاہر ہے، پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے، سپاہیو! اسے چوک میں لے جاکر بار ڈھ مار دو۔ قصبے کے بڑے چوک میں لے جاکر سب کے سامنے گولی سے ہلاک کردو۔ (وقفہ) کیپٹن ولیم سب انتظام ٹھیک ہے نا۔ میں کوئی بات بھول تو نہیں گیا۔

میئر۔ (کرسی سے اٹھتے ہوئے) آپ مجھے بھول گئے ہیں۔ کرنل صاحب (وقفہ) ہاریت تم جانتے ہو، میں اس شہر کا میئر ہوں، اس شہر کے لوگوں نے مجھے چنا ہے، شہر کے لوگوں نے مجھے چنا ہے، شہر کے لوگ کہتے ہیں کہ تمہاری سزا میں میرا بھی ہاتھ ہے۔ مجھے ان لوگوں کی کوئی پرواہ نہیں۔ میں صرف تمہیں اپنی معصومیت کا یقین دلانا چاہتا ہوں، کیونکہ تم موت کے منہ میں جا رہے ہو، میری بات سن رہے ہو ہاریت!

ہاریت۔ (مضطرب ہوکر) ہاں۔ میئر۔

میئر۔ ہاریت یہ لوگ غاصب ہیں۔ ان لوگوں نے ہمارے ملک پر قبضہ کرلیا ہے،

دھوکے سے فریب سے، طاقت سے،

ولیم۔(غصّے سے) اس باغیانہ تقریر کی یہاں اجازت نہیں دی جا سکتی۔

کرنل۔چپ رہو ولیم، یہی بہتر ہے کہ اسے صاف صاف سن لیا جائے، یا تم یہ پسند کرو گے کہ لوگ اسے بند کمروں میں اپنے گھروں میں بار بار دہراتے رہیں۔

میئر۔جب دشمن غالب آئے تو اس وقت لوگوں کو کچھ پتہ نہ تھا کہ شکست کیا ہوتی ہے، غلامی کیا ہوتی ہے، دوسرے کا راج کیا معنی رکھتا ہے، وہ حیران تھے، چپ چاپ، پتھّر کے بتوں کی طرح ساکت تھے لیکن تمہارا غصّہ —— اسی اجتماعی انتقام کی پہلی لہر ہے، جو آج ملک کے رگ وپے میں اک آتشیں سیّال کی طرح دوڑ رہی ہے

ہاریت۔میں جانتا ہوں میئر۔

میئر۔(ہاریت کے شانے پر ہاتھ رکھ کر) ہاریت کیا تمہیں موت سے ڈر لگتا ہے؟

ہاریت۔(بھرائی ہوئی آواز میں) ہاں۔ میئر۔

ولیم۔گارد تیار ہے کرنل!

میئر۔جاؤ، ہاریت! موت کے دروازے پر جاتے ہوئے میں تم سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں، کہ ان غاصبوں کو آج سے کبھی چین کا سانس

نہ مل سکے گا، ایک لمحے کے لئے بھی نہیں، دن اور رات کے ہر پل میں ایک ہولناک، نظر نہ آنے والے اجتماعی ڈر کا بھیانک احساس، ان کے تاریک دلوں پر مسلط ہو جائے گا۔ ایک لحظہ کے لئے بھی انہیں چین نہ ہوگا ..... الوداع ہاریت۔

ہاریت۔ الوداع میٹر۔

کرنل۔ (بلند آواز میں) سپاہیوں کو بلاؤ۔

منظر پنجم

بڑا ہال جو منظر دوم میں دکھایا گیا ہے۔ جہاں فوجی افسر پڑے ہوتے ہیں۔ اس ہال میں روشنی کم اور اندھیرا زیادہ ہونا چاہیئے تاکہ اُداسی، اور ہیبت کا احساس طاری ہو سکے۔ دو تین میزوں پر موم بتیاں جل رہی ہیں۔ ان کی روشنی میں کمرے کی بلندیوں پر عجیب عجیب سائے نظر آ رہے ہیں۔ لفٹنٹ روشر، آئیٹل، رسن برگ ایک میز پہ تاش کھیل رہے ہیں۔ یوں سمجھیئے کہ تاش کھیلنے کی کوشش کر رہے ہیں، ڈاڑھیاں بڑھی ہوئی ہیں، آنکھوں میں ڈر کی چمک ہے۔ میجر ان کے قریب نقشہ بنا رہا ہے۔ ولیم وردی پہن رہا ہے۔

لفٹنٹ روشر۔ میجر، بجلی کا ڈائنمو ٹھیک ہو گیا۔

میجر۔ چھ مستری اس کام پر لگا رکھے ہیں، گارد کا پہرہ بھی ہے، پھر بھی نجانے کیوں بجلی فیل ہو جاتی ہے۔

روشر۔ مجھے ان موم بتیوں سے سخت نفرت ہے، میں بجلی کی روشنی چاہتا ہوں
میجر۔ (سختی سے) لفٹنٹ روشر تمہاری طبیعت کچھ خراب معلوم ہوتی ہے۔
تمہارے اعصاب پر جنگ کا بہت بُرا اثر پڑا ہے، اپنی عقل کو ٹھکانے رکھو، اپنے آپ کو قابو میں رکھو،
روشر۔ میجر میں گھر جانا چاہتا ہوں۔ (بچّوں کی طرح بلکتے ہوئے) میں اپنی محبوبہ سے ملنا چاہتا ہوں، اس کی صورت دیکھتے ہوئے مجھے کتنی مدّت گذر گئی ہے
میجر۔ اپنے آپ کو قابو میں رکھو (وقفہ) ولیم آج کی رپورٹ کیا ہے۔ کوئی نیا حادثہ۔
آئیٹل۔ (تاش کے پتّے میز پر پھینکتے ہوئے) ہر روز نئے حادثے ہوتے رہتے ہیں، کوئی پہرے دار اُونگھ گیا۔ اور اس کی لاش برف میں پائی گئی۔ کوئی سپاہی گارد سے ذرا الگ ہوا، اور دوسرے دن اس کی لاش پہاڑ کی کھڈ میں پائی گئی۔ کوئی فوجی کسی عورت کے بلاوے پر اس کے گھر گیا اور ہمیشہ کے لئے غائب ہو گیا۔
ولیم۔ میجر، لفٹنٹ روشر اور آئیٹل کا کورٹ مارشل ہونا چاہیئے۔ یہ کیسی باتیں کرتے ہیں۔
میجر۔ کہنے دو، انہیں۔ اس سے جی کا بار ہلکا ہوتا ہے (وقفہ) ہاں تم انہیں

رپورٹ سناؤ۔

ولیم۔ کان میں ایک حادثہ ہوا تھا۔ بی سیکشن میں بجلی فیل ہوگئی۔ چھ گھنٹے کام بند رہا۔ دو ٹرالیاں ٹوٹ گئیں۔

میجر۔ ہُم۔

ولیم۔ ریل کے پل کی مشرقی دیوار کسی نے ڈائنا میٹ لگا کر اڑا دی۔

میجر۔ کمبخت ہمیشہ مشرقی دیوار ہی کو اڑاتے ہیں۔

لفٹننٹ رسن برگ۔ سنا ہے کرنل نے مزید کمک منگوانے کے لئے لکھا ہے۔

آنیٹل۔ (عدم اعتمادی سے) مزید کمک آئے گی میجر!

میجر۔ شاید؟

آنیٹل۔ (رجائی لہجے میں) اور ہمیں چھٹی ملے گی (چہرے پر تبسم آجاتا ہے چھٹی کے تخیّل ہی سے)

میجر۔ (ہنس کر) تم تو یہاں رہنا چاہتے تھے۔ یہ خوبصورت وادی ایک چھوٹی سی فارم (نقل اتارتے ہوئے) ایک چھوٹا سا باغ، چند بھیڑیں، آرام اور سکون کی زندگی۔

لفٹننٹ رسن برگ۔ (پریشان ہوکر) چپ رہو میجر، خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو۔

آنیٹل۔ جان! برانڈی ہے یا کوئی اور شراب۔

(جان دور سے منمناتا ہے)

آئیٹل۔ (غضبناک ہو کر) سر کیوں ہلاتے ہو۔ زبان سے کہو، اُلو کے پٹھے!
جان۔ (قریب آکر) نہیں جناب شراب نہیں ہے۔
آئیٹل۔ اور برانڈی؟
جان۔ برانڈی بھی نہیں ہے۔
آئیٹل۔ تو پھر تم یہاں کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ اُلو، حرامزادے۔
جان۔ میں جانا چاہتا ہوں۔
آئیٹل۔ (چیخ کر) تو دفع ہو جاؤ۔ جاؤ۔ جاؤ!!! دفع ہو جاؤ یہاں سے۔

(جان چلا جاتا ہے)

رسن برگ۔ تمہیں اپنی طبیعت پر جبر کرنا چاہیے۔ خصوصاً ان لوگوں کے سامنے یہ ہمارے دشمن ہیں، یہ ہماری کمزوری سے کسی وقت بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

روشر۔ (جذبات سے مغلوب ہو کر) جبر، جبر، جبر، جب سنو جبر۔ میں سپاہی محض لیکن میں انسان بھی ہوں، مجھے یہاں اپنے چاروں طرف نفرت ہی نفرت

نظر آتی ہے۔ میں سپاہی ہوں لیکن میں انسان بھی ہوں، میں خوبصورت لڑکیوں کی ہنسی سننا چاہتا ہوں، (اپنے آپ سے) ناچ..... نغمہ..... اور کسی کے گداز جسم کی مہک اور آتش دان میں چٹختی ہوئی لکڑیوں کی میٹھی مدھم آنچ۔ اور اپنے دوستوں کی خوش فعلیاں (یک لخت بلند آوازیں۔ آواز سے ہسٹریا کے دورے کا شبہ ہوتا ہے) لیکن یہاں کیا ہے۔ جب میں کسی ڈانس ہال میں گھستا ہوں، ناچ بند ہو جاتا ہے، ہنسی ہونٹوں پر رک جاتی ہے، لوگ برفیلی نگاہوں سے میری طرف تاکنے لگتے ہیں۔ کسی ریستوران میں جاتا ہوں تو کھانے کی اشتہا انگیز مہک میرے احساس کو للچا دیتی ہے کھانا منگاتا ہوں تو جی جل کر کباب ہو جاتا ہے۔ کسی کھانے میں نمک کم ہے کسی کھانے میں مرچ زیادہ ہے، سالن کڑوا ہو گیا ہے، تو روٹی جل گئی ہے۔ اور پھر وہی ویٹر کی نگاہیں! سرد، برفیلی، خاموش!

رسن برگ۔ چپ ہو جاؤ۔ روشر، خدا کے لئے۔

(دروازہ زور سے کھلتا ہے)

آئیٹیل۔ (کانپ کر) وہ دروازہ کیوں کھلا۔

(کرنل اندر داخل ہوتا ہے)

کرنل۔ کیا بات ہے۔ کون اتنے زور سے چیخ رہا تھا۔

میجر۔ (نقشہ بناتے ہوئے) کچھ نہیں، روشر بے چارہ ایک اعصابی کشمکش میں مبتلا ہے

کرنل۔ (دستانے اتارتے ہوئے) ہاں ایسا بھی ہوتا ہے اکثر۔

میجر۔ کوئی نئی خبر کرنل؟

کرنل۔ سب ٹھیک ہے۔

میجر۔ انگریز لڑ رہے ہیں؟

کرنل۔ ہاں، تھوڑا بہت، لیکن انہیں شکست ہو چکی ہے۔

میجر۔ اور روسی۔

کرنل۔ ہار چکے ہیں، لیکن کبھی ایک آدھ بار پھریری سی لے لیتے ہیں۔

میجر۔ ساری دنیا ہماری ہے

کرنل۔ ساری دنیا ہماری ہے۔

روشر۔ (طنزیہ انداز میں بلند لہجے میں) ساری دنیا ہماری ہے اور ہم اکیلے ہیں، ساری دنیا ہماری ہے اور ہم سایوں سے بھی ڈرتے ہیں، ساری دنیا ہماری ہے رات کی تاریکی میں اکیلے باہر نہیں نکل سکتے۔

رسن برگ۔ چپ رہو روشر۔

روشر۔ (ان سنی کرتے ہوئے) ساری دنیا ہماری ہے اور کوئی ہم سے کلام نہیں کرتا۔ کوئی ہم سے محبت نہیں کرتا، کوئی ہمیں دیکھ کر نہیں مسکراتا، ساری دنیا ہماری ہے، اور ہر روز حادثے ہوتے ہیں، گولیاں چلتی ہیں۔ ریلیں اکھاڑی جاتی ہیں، کانیں تباہ ہوتی ہیں، گولیوں کی سنسناتی ہوئی آواز ہمارے سینوں

کو چیرتی ہوئی نکل جاتی ہے۔

ولیم۔(ڈپٹ کر) خاموش بدزبان۔

روشر۔سنا تم نے میرے پیارے کرنل۔ہم فاتح ہیں (ہسٹریائی ہنسی) ہم نے ساری دنیا کو فتح کر لیا ہے۔لیکن کسی ایک کے دل کو فتح نہ کر سکے (ہنسی میں سسکی لیتے ہوئے) مجھے اس لڑکی سے محبت ہے جو شہر کی فصیل کے قریب پرانی سڑک پر رہتی ہے —— اس کی بھوری، بڑی بڑی آنکھیں اور سنہری بال —— سنا تم نے میرے پیارے کرنل، ہم نے ساری دنیا کو فتح کر لیا ہے۔ لیکن کسی ایک کے دل کو بھی فتح نہ کر سکے۔

کرنل۔کیا کر رہے ہو روشر۔اپنی طبیعت کو قابو میں رکھو۔

روشر۔کرنل کل میں نے ایک سپنا دیکھا، میں نے دیکھا کہ لیڈر —— ہمارا لیڈر پاگل ہو گیا ہے۔ہاہاہا۔اور چلّا چلّا کر کہہ رہا ہے۔میں نے ساری دنیا کو فتح کر لیا ہے، میں نے ساری دنیا کو فتح کر لیا ہے! میں نے ساری دنیا کو فتح کر لیا ہے!!

ولیم۔(زور سے چانٹا لگا کر) خاموش! بدزبان!

روشر۔(سسکیاں لیکر) میں گھر جانا چاہتا ہوں..... میں گھر جانا چاہتا ہوں۔

منظر ششم

ہاریت کے گھر میں بیٹھنے کا کمرہ، کمرے سے نسائی آرائش اور سلیقے کا اظہار ہوتا ہے۔ ہاریت کی بیوہ لوئیزا کپڑے سینے کی مشین پر کام کر رہی ہے۔ سیاہ کپڑوں سے اُس کا حسن اپنی پوری تابانی پر ہے گنگنا رہی ہے۔ ایک بڑی سی قینچی سے کپڑا کاٹنے لگتی ہے کہ دروازے پر دستک ہوتی ہے۔

(دستک)

لوئیزا۔ آیئے!

اینی۔ اندر داخل ہوتے ہوتے) ہیلو۔ لوئیزا۔

لوئیزا۔ ہیلو، اینی، اس وقت کیسے؟

اینی۔ (ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر) شش۔ ابھی تھوڑی دیر میں میئر یہاں آئیں گے۔

لوئیزا۔ کیوں؟

اینی۔ فلپس اور اس کا بھائی آج دونوں یہاں سے انگلینڈ کو بھاگ رہے ہیں۔ آج چاند بھی نہیں ہے۔ اور انہیں ایک اچھی کشتی بھی مل گئی ہے۔ میئر ان سے

بات کرنا چاہتے ہیں اور انہیں ایک پیغام دینا چاہتے ہیں۔

لوئیزا۔ انگریزوں کے لئے

اینی۔ ہوں،

لوئیزا۔ وہ کب آئیں گے یہاں،

اینی۔ کوئی پون گھنٹے تک، میں تمہیں اطلاع دینے آئی تھی۔ میجر نے کہا میں فلپس اور اس کے بھائی کو لوئیزا کے مکان پر ملوں گا، اس، اس حادثے کے بعد میجر کو تمہارا بڑا خیال رہتا ہے (ایک پیکٹ دیتے ہوئے) لو یہ تھوڑا سا گوشت انہوں نے بھیجا ہے۔ اچھا میں اب چلتی ہوں، خدا حافظ لوئیزا۔

لوئیزا۔ خدا حافظ اینی۔

(پھر قینچی سے کپڑا کتر کر سینا شروع کر دیتی ہے، اور گنگنائے جاتی ہے، اتنے میں دروازے پر پھر دستک ہوتی ہے اور لفٹنٹ روشر اندر داخل ہوتا ہے)

لوئیزا۔ (چونک کر) کون ہے؟ (کھڑی ہو جاتی ہے)

روشر۔ (دروازے پر کھڑے ہو کر) میں ہوں —— میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔

لوئیزا۔ تم یہاں کیوں آئے ہو۔ تم یہاں کیوں آئے ہو؟

روشر۔ (لجاجت سے) میں —— میں صرف تمہاری باتیں سننا چاہتا ہوں،

تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچانا چاہتا! (روشر قریب آجاتا ہے)

لوئیزا۔ تم زبردستی اندر گھس آئے ہو؟ یہ مناسب نہیں ہے۔

روشر۔ پلیز، مس! میں ابھی تھوڑی دیر میں واپس چلا جاؤں گا (لوئیزا کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے) میں دشمن کا فوجی ہوں، لیکن میں تمہیں کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتا (وقفہ —— لوئیزا بیٹھ جاتی ہے) کیا تم اسے سمجھ سکتی ہو کیا تم تھوڑی دیر کے لئے اس پر یقین کر سکتی ہو، کیا ہم تم تھوڑی دیر کے لئے اس جنگ کو بھول نہیں سکتے ہم اور تم۔ صرف چند لمحوں کے لئے، دو سیدھے سادھے انسانوں کی طرح بات نہیں کر سکتے؟

لوئیزا۔ تم نہیں جانتے میں کون ہوں؟ شاید تم نہیں جانتے میں کون ہوں۔ تم مجھے جانتے ہو؟

روشر۔ میں نے تمہیں اس قصبے کی سڑکوں پر اکثر دیکھا ہے۔ ان بڑی بڑی بھوری آنکھوں اور سنہرے بالوں کو دیکھنے کی اکثر تمنا کی ہے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں، کہ تم بے حد خوبصورت ہو، میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

لوئیزا۔ ہوں۔ تم بے شک اکیلے ہو۔ تنہائی کا احساس بہت برا ہوتا ہے۔ لفٹنٹ۔

روشنر۔ تم خوب سمجھتی ہو۔ میرا بھی یہی خیال تھا تم میری حالت ضرور سمجھ سکو گی۔ یہ خوفناک المناک تنہائی، میری جان کو کھائے جاتی ہے، اس گہری خامشی اور نفرت کے درمیان میں اپنے آپ کو بالکل تنہا اور بے یار و مددگار محسوس کرتا ہوں۔

لوئیزا۔ تم یہاں دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں بیٹھ سکتے۔

(مدھم سے کھڑکے کی آواز)

روشنر (چونک کر) کیا یہاں کوئی اور بھی ہے ؟

لوئیزا۔ نہیں۔ یہ چھت سے برف گرنے کی آواز تھی۔ چھت سے برف ہٹانے کے لئے میرے پاس اب کوئی آدمی نہیں ہے۔

روشنر۔ کیا اس صورتِ حالات کے ہم ذمہ دار ہیں۔

(لوئیزا محزوں انداز میں سر ہلاتی ہے)

روشنر۔ مجھے افسوس ہے (وقفہ) اگر میں اس بارے میں کچھ کر سکوں! میں کل اس چھت پر سے برف ہٹوا دوں گا۔

لوئیزا۔ (چونک کر) نہیں۔ نہیں۔ ہرگز نہیں !

روشنر۔ کیوں ؟

لوئیزا۔ لوگ سمجھیں گے میں دشمنوں سے مل گئی ہوں۔

روشنر۔ آں، ہاں۔ میں سمجھا۔ (وقفہ) تم سب ہم سے نفرت کرتے ہو۔ تم سب (وقفہ) لیکن میں تمہاری نگہداشت کر سکتا ہوں۔ اگر تم اجازت دو۔ تو

میں تمہاری حفاظت کروں گا!

لوئیزا۔ تم مجھ سے پوچھتے کیوں ہو لفٹنٹ۔ تم فاتح ہو جو چاہو کر سکتے ہو، تمہارے سپاہیوں کو کچھ کہنے کی حاجت نہیں ہوتی۔ وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔

روشر۔ میں ـــــ میں ایسا نہیں چاہتا۔

لوئیزا۔ (حزیں مسکراہٹ سے) تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں پسند کروں۔ ہے نا!

روشر۔ ہاں، (وقفہ) تم کس قدر حسین ہو، تمہارے چہرے میں، تمہارے بالوں میں، تمہاری گردن کے خم میں ڈوبتے ہوئے آفتاب کی ساری خوبصورتی سما گئی ہے، ہاں میں چاہتا ہوں تم مجھے پسند کرو۔ جگ بیت گئے، میں جب سے یہاں آیا ہوں عورت کی نرم ملائم، پیار بھری نگاہوں سے محروم رہا ہوں۔

لوئیزا۔ تم مجھ سے پیار کرنا چاہتے ہو لفٹنٹ، اور چاہتے ہو کہ میں بھی تمہیں پسند کروں۔ کیونکہ اسی طرح یہ محبت زیادہ دلکش اور خوشگوار معلوم ہوتی ہے۔

روشر۔ ہاں، ہاں، میں چاہتا ہوں کہ ـــــ کہ ـــــ دیکھو میں نے سپاہیوں کو حکم دے رکھا ہے کہ راستے میں تمہیں کوئی نہ چھیڑے، کیا تمہیں کسی نے دق تو نہیں کیا؟

لوئیزا۔ نہیں۔ شکریہ!

روشر۔ اور میں نے ایک نظم بھی لکھی ہے۔ تمہارے لئے۔ کیا تم اسے سنو گی۔

لوئیزا۔ بہت لمبی تو نہیں۔ تمہیں تھوڑی دیر میں واپس چلا جانا ہو گا۔

روشر۔ (جیب ٹٹولتے ہوئے اور قریب آکر) نہیں، نہیں، ایک چھوٹی سی نظم ہے (جیب سے نکال کر) یہ رہی۔ پڑھو اسے۔

لوئیزا۔ (پڑھ کر) کیا نظم تم نے خود لکھی ہے۔

روشر۔ ہاں!

لوئیزا۔ میرے لئے

روشر۔ ہاں!

لوئیزا۔ سچ مچ لفٹنٹ، یہ نظم تم نے لکھی ہے؟ (وقفہ) یقیناً یہ نظم تم نے نہیں لکھی۔

روشر۔ (اقبال کرتے ہوئے) مسکرا کر) نہیں!

لوئیزا۔ تو پھر۔

روشر۔ میں نے اسے کتاب میں پڑھا تھا۔ مجھے یہ نظم بہت پسند ہے (ہنستا ہے)

(لوئیزا اور روشر دونوں ہنستے ہیں)

روشر۔ (رک کر) میں مدتوں کے بعد اس طرح ہنسا ہوں، (وقفہ) تم کس قدر حسین ہو، جنگل کے جھرنے کی طرح معصوم، بہتی ہوئی ندی کی طرح دلفریب۔

لوئیزا۔ (مسکراکر) تم نے پھر محبت جتانی شروع کر دی۔

روشر۔ شاید! میں تم سے محبت کرنا چاہتا ہوں، آدمی کو محبت کی ضرورت ہے آدمی محبت کے بغیر مر جاتا ہے، محبت کے بغیر اس کی روح کا سرچشمہ خشک ہو جاتا ہے، اور جسم راکھ کا ڈھیر!

لوئیزا۔ (وقفے کے بعد) تم میری محبت چاہتے ہو لفٹننٹ (تلخ لہجے میں) میری محبت کی قیمت ہے ڈبل روٹی کے دو ٹکڑے۔

روشر۔ تم کیسی باتیں کرتی ہو۔

لوئیزا۔ میرا خاوند مر چکا ہے، اور میں تنہا اور اکیلی ہوں، اور چھت پر برف بھاری ہے، یہی برف میرے سینے میں بھی منجمد ہو کر رہ گئی ہے۔

روشر۔ تم ایسی باتیں کیوں کرتی ہو؟

لوئیزا۔ میں اکثر بھوکی رہتی ہوں، میں جانتی ہوں بھوکے رہنے کا احساس اچھا نہیں ہوتا۔ میری قیمت ڈبل روٹی کے صرف دو ٹکڑے ہیں اور تھوڑا سا گوشت۔

روشر۔ خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو۔ یہ سچ نہیں ہے۔

لوئیزا۔ (جھکے ہوئے لہجے میں) ہاں یہ سچ نہیں ہے۔ میں بھوکی نہیں ہوں میں تم سے نفرت نہیں کرتی۔

روشر۔ (خلوص سے) میں ایک معمولی لفٹننٹ ہوں، میں صرف ایک آدمی

ہوں۔ مجھے کسی ملک کے فتح کرنے کی خواہش نہیں ہے۔

لوئیزا۔ میں جانتی ہوں۔ میں جانتی ہوں۔

روشر۔ (اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر) موت کے اس گرجتے ہوئے طوفان میں زندگی کے چند لمحے چاہتا ہوں۔

لوئیزا۔ (خوابیدہ لہجے میں) میں جانتی ہوں۔ میں سمجھتی ہوں۔

روشر۔ کیا اس اتنی سی زندگی، اتنی سی خوشی پر بھی ہمارا حق نہیں (وقفہ) کیا بات ہے؟ کیا بات ہے؟ تم خلا میں کیسے گھور رہی ہو؟

لوئیزا۔ (جیسے اپنے سامنے ہاریت کو دیکھ رہی ہے) وہ ڈر رہا تھا اور میں اسے کپڑے پہنا رہی تھی، اُجلے صاف کپڑے، میں نے اس کی قمیص میں بٹن لگائے اور وہ ڈر سے کانپ رہا تھا۔

روشر۔ (حیران ہو کر) تم کیا کہہ رہی ہو؟

لوئیزا۔ (قدرے گھورتے ہوئے) وہ اسے گھر کیوں لائے، وہ حیران تھا کہ کیا ہونے والا ہے، اسے کچھ پتہ نہ تھا۔ وہ اُجلے کپڑے پہنے، نہایت سنجیدہ طریق سے سپاہیوں کے ساتھ گھر سے باہر نکلا، جیسے بچہ پہلی بار سکول جا رہا ہو۔

روشر۔ وہ تمہارا خاوند تھا۔

لوئیزا۔ ہاں وہ میرا خاوند تھا۔ اور میں اس کے لئے میئر کے پاس گئی۔ لیکن میئر

بھی مجبور تھا۔ وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ (غصے سے) اور —— پھر تم اسے پکڑ کر باہر لے گئے۔ اور تم نے چوک میں لیجا کر اسے گولی مار دی۔ مجھے یقین نہیں آتا۔

(سسکیاں لیتی ہے)

روشر۔ وہ تمہارا خاوند تھا!

لوئیزا۔ ہاں۔ لیکن اب مجھے یقین آجاتا ہے، اس اکیلے گھر کو دیکھ کر مجھے یقین آجاتا ہے، چھت پر گہری برف کو دیکھ کر مجھے یقین آجاتا ہے، اس خالی بستر کو دیکھ کر اور سورج نکلنے سے پہلے کی خوفناک تنہائی کو دیکھ کر مجھے یقین آجاتا ہے (لوئیزا دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیتی ہے) کاش یہ سچ نہ ہوتا!

روشر۔ (اٹھتے ہوئے) گڈ نائٹ! خدا تمہاری حفاظت کرے۔ (وقفہ) کیا میں پھر کبھی آسکتا ہوں۔

لوئیزا۔ میں کچھ نہیں جانتی۔

روشر۔ میں پھر آؤں گا۔

لوئیزا۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔

(روشر چلا جاتا ہے۔ لوئیزا چہرہ ہاتھوں میں چھپائے سسکیاں لیتی رہی ہے، تھوڑی دیر کے بعد ایلی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتی ہے۔)

اینی لوئیزا یہ کون تھا؟

لوئیزا۔ (چیخ مار کر) اینی!

اینی۔ (قریب آ کر) میں نے جاتے وقت اسے دیکھا تھا۔ ایک سپاہی۔ دشمن کی فوج کا سپاہی۔ (لوئیزا کی طرف غور سے مشتبہ نگاہوں سے تکتی ہے۔)

لوئیزا۔ اُداس تھکے ہوئے لہجے میں) ہاں اینی وہ دشمن کا سپاہی تھا۔ مجھ سے عشق جتانے آیا تھا۔

اینی۔ (چلّا کر) لوئیزا! لوئیزا!!

لوئیزا۔ (اطمینان سے) میں اپنے ہوش و حواس میں ہوں۔

اینی۔ (مشکوک لہجے میں) تم دشمن کے ساتھ تو نہیں مل گئی ہو؟

لوئیزا۔ اس کا کوئی اندیشہ نہیں۔ اینی!

اینی۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو،

لوئیزا۔ ہاں۔

اینی۔ میں میرا اور ان دونوں لڑکیوں کو یہاں بلاؤں جو آج انگلینڈ روانہ ہو رہے ہیں۔

لوئیزا۔ ہاں اینی، بے فکر رہو، کوئی خطرہ نہیں ہے۔ مجھ پر اعتبار کرو۔

اینی۔ اگر وہ سپاہی پھر آیا۔

لوئیزا۔ میں اسے نہ آنے دوں گی، فکر نہ کرو۔

اینی۔ (جسے اعتبار نہیں آتا) لوئیزا!

لوئیزا۔ (فیصلہ کن لہجے میں) اینی میئر کو اندر بلا لو۔ اور ان دونوں لڑکوں کو بھی، وہ کہاں کھڑے ہیں۔

اینی۔ پچھلے دروازے کے جنگلے کے قریب۔

لوئیزا۔ انہیں اندر لے آؤ۔

اینی۔ بہت اچھا۔

(لوئیزا قینچی سے کپڑا کاٹتی ہے۔ اور مشین
چلاتی ہے اور گنگناتی ہے)

میئر۔ (اندر داخل ہوتے ہوئے) ہیلو لوئیزا (میئر کے ساتھ ہی فلپس اور اس کا چھوٹا بھائی اور اینی ہیں) تمہیں معلوم ہے۔ (فلپس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) فلپس اور اس کا بھائی ——

لوئیزا۔ (اٹھ کر میئر کی طرف بڑھتے ہوئے) ہاں میئر مجھے اینی نے ابھی بتایا ہے

میئیر۔ (بیٹھتے ہوئے) اینی! دروازے میں کھڑی رہو۔ اور جب گارڈ قریب آئے تو دروازے پر ایک دستک دینا۔ اور جب گارڈ گذر جائے۔ تو دوبارہ دستک دینا۔

اینی۔ بہت اچھا! (دروازے کے باہر چلی جاتی ہے)

فلپس۔ آج ہم انگلینڈ جا رہے ہیں لوئیزا۔

لوئیزا۔ (بے خیالی میں) آج کی رات اندھیری ہے۔

فلپس۔ (ہنستے ہوئے) بھاگنے کے لئے یہ اچھی رات ہے۔

لوئیزا۔ میں نے سنا ہے تم مسٹر بارل کو بھی اپنے ہمراہ لئے جا رہے ہو۔

فلپس۔ (نہایت مسرت اور اطمینان سے) ہاں۔ ہم نے اس کی مضبوط کشتی چرائی ہے۔ تو اب سوچا کہ اسے بھی ساتھ لئے چلنا چاہیئے۔ اس کا اس جگہ رہنا ہمیں زیادہ پسند نہیں، اس لئے یہی بہتر ہے کہ ہم اُسے اپنے ساتھ لے جائیں، اور سمندر کی نذر کر دیں۔

لوئیزا۔ کیا تم اسے سمندر میں پھینک دو گے۔

فلپس۔ ایسا کرنا ہی پڑے گا۔ (میئیر سے مخاطب ہو کر) میئیر آپ کوئی خاص پیغام دینا چاہتے ہیں۔

میئیر۔ میں اپنے انگریز دوستوں سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں، کہ فرانس زندہ ہے، شکست کے بعد بھی زندہ ہے، وہ مرا نہیں، اس کی روح زندہ و

پائندہ ہے۔ لڑائی جاری ہے۔ خاموش، مسلسل، متواتر، اور اس وقت تک جاری رہے گی۔ جب تک فرانس غاصبوں کو اپنے ساحلوں سے باہر نہیں نکال دیتا (وقفہ) ہم لوگ نہتے ہیں، اگر ہم دشمن کے ایک سپاہی کو قتل کرتے ہیں تو ہمارے پچاس آدمی مارے جاتے ہیں، ہمیں مدد کی ضرورت ہے، بڑی مدد کی نہیں۔ وہ وقت بھی آئے گا۔ اس وقت ہمیں چھوٹے چھوٹے ٹائم بموں اور ڈائنامیٹ کے فلیتوں کی ضرورت ہے، جو انگریزی بمبار نیچے گرا سکیں۔ جو ہم لوگ اپنی جیبوں میں بآسانی چھپا سکیں جنہیں استعمال کرنا زیادہ مشکل نہ ہو۔

(اینی ایک بار دستک دیتی ہے، میئر خاموش
ہو جاتا ہے۔ گارد کے گذرنے کی آواز سنائی دیتی ہے)

فلپس۔ خاموش! —— (وقفہ) تیز تیز دوڑنے کی آواز (گولی چلنے کی آواز)

(وقفہ)

اینی۔ (دوبارہ دستک دیتی ہے۔ گارد کے قدموں کی آواز دور چلی جاتی ہے)

میئر۔ ہمارے انگریز دوستوں کو بتا دینا کہ ہم ان حالات میں دشمن کا مقابلہ کر رہے ہیں، نہ دن کو چین ہے نہ رات کو نیند۔ ہمیں یہ چھوٹے چھوٹے اسلحہ جات درکار ہیں، جن سے ہم دشمن کے آمد و رفت کے وسائل کو تباہ کر سکیں، اس کا جینا حرام کر دیں، وہ کوئلہ یہاں سے باہر نہ لے جا سکے، جہازوں کو آگ لگ جائے، ریل کی پٹریاں اکھڑ جائیں، فوجیں نقل و حرکت نہ کر سکیں (وقفہ) فرانس کی روح زندہ ہے، روح جو غلامی کو دنیا کی بدترین لعنت سمجھتی ہے!

فلپس۔ ہم آپ کے انگریز دوستوں تک آپ کا پیغام پہنچا دیں گے۔

اینی ایک بار دستک دیتی ہے۔ سب چپ ہو جاتے ہیں۔ اینی اندر داخل ہوتی ہے۔)

میئر۔ اینی کیا بات ہے؟

اینی۔ ایک سپاہی ادھر آرہا ہے۔ لوئیزا۔ میرے خیال میں یہ وہی سپاہی ہے۔

میئیر۔ کیا بات ہے لوئیزا (وقفہ) تمہیں کسی بات کی تکلیف ہے۔

لوئیزا۔ نہیں۔

میئیر۔ یہ سپاہی کون ہے؟

لوئیزا۔ دشمن کی فوج میں لفٹنٹ ہے۔ مجھ سے عشق جتانا چاہتا ہے۔

میئیر۔ تم اس کے جال میں نہ پھنسو گی۔

لوئیزا۔ نہیں۔

میئیر۔ لوئیزا میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں۔

لوئیزا۔ (آبدیدہ ہو کر) نہیں۔

اینی۔ لوئیزا۔ تم اس سپاہی کو تو کچھ نہ بتاؤ گی۔

لوئیزا۔ اطمینان رکھو۔ (وقفہ۔ قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ لو اب تم پچھلے دروازے سے جلدی باہر نکل جاؤ۔ جلدی کرو۔ وہ آرہا ہے۔

میئیر۔ خدا حافظ لوئیزا (دروازے پر دستک ہوتی ہے) خدا حافظ۔ جلدی کرو۔

(دروازے پر پھر دستک ہوتی ہے۔)

(وقفہ)

شکست کے بعد

(ہیئر اور فلپس اور اس کا چھوٹا بھائی اور اینی پچھلے دروازے سے باہر نکل جاتے ہیں۔)

(دروازے پر پھر دستک ہوتی ہے۔ لوئیزا اک دم کپڑا کترنے کی بڑی قینچی اٹھا لیتی ہے، اور دروازے پر بڑھتی ہے)

لوئیزا۔ ٹھہرو! میں آرہی ہوں لفٹنٹ۔ (زیرِ لب) میں آرہی ہوں لفٹنٹ

منظر ہفتم

(میئر کے گھر کا بڑا ہال)

۱

کیپٹن ولیم۔ کل رات کو انگریزی بمباروں نے کوئلے کی کان کے قریب اور باہر دیہات میں ڈائنامیٹ کے فلیتے اور چھوٹے چھوٹے ٹائم بمب پھینکے۔

میجر۔ اور چاکولیٹ بھی۔ میں نے دو ایک کھائے تھے۔ بے حد مزے دار تھے، سچ مچ کرنل!

ولیم۔ کل سے آج صبح تک پانچ حادثے ہوئے۔ سب ریل کی پٹڑیوں پر۔

میجر۔ پانچ حادثے۔ ایک رات میں؟ میرے پاس اتنی فالتو ریلوے لائن نہیں ہے۔

کرنل۔ تمہیں پرانے سٹیشنوں کی سائڈنگ اکھاڑنا پڑیں گی۔

میجر۔ مگر خیال تو کیجئے، پانچ جگہ سے ریل کی پٹڑی اکھاڑی جا چکی ہے۔ آخر کوئی حد بھی تو ہے۔

کرنل۔ جنگ میں سب کچھ کرنا پڑتا ہے (وقفہ) مجھے کوئلہ ضرور باہر بھیجنا ہے۔

اس کام کو ہر صورت میں پورا کرنا ہوگا۔

میجر۔ اب کیا ہوگا؟

کرنل۔ پتہ نہیں۔ میں نے ہیڈکوارٹرز ٹیلی فون کیا تھا وہ کہتے ہیں انگریزی بمباروں نے صرف یہاں پر فلیتے اور بمب پھینکے ہیں۔ اگر ان کا تجربہ یہاں کامیاب رہا۔ تو شاید دوسری جگہوں پر بھی یہی حربہ استعمال کیا جائے گا۔

ولیم۔ مگر اس کا تدارک ہونا چاہیے جناب!

کرنل۔ ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔ (وقفہ) اب ان لوگوں کے ساتھ نرمی نہیں برتی جا سکتی۔ (فیصلہ کن لہجے میں) کیپٹن ولیم، ان فسادیوں کو پکڑ لو۔ اور گولی مار دو (وقفہ) باہر دیہاتوں میں فلیتوں اور ٹائم بمب ڈھونڈھنے والوں اور ریل کی پٹڑی کے قریب چلنے والوں کے لئے پھندے لگا دو۔ اور جو پکڑا جائے اسے گولی مار دو۔

ولیم۔ جناب میں تجویز کرتا ہوں، میئر کو گرفتار کر لیا جائے۔ میرے خیال میں سارے فساد کی جڑ یہ میئر ہے۔

میجر۔ اگر میئر نہ ہوتا تو زیادہ خون خرابہ ہوتا۔

ولیم۔ میں پھر عرض کرتا ہوں۔ کہ میئر کو گرفتار کر لیا جائے۔ آپ نہیں جانتے کہ جس دن فلیس اور اُس کا بھائی رات کو یہاں سے انگلینڈ کو بھاگ نکلے اسی روز ہاریت کی بیوہ لوئیزا کے ہاں وہ دونوں اور میئر بھی موجود تھے۔

اسی رات کو جارج بارل لاپتہ ہوا۔ اسی روز وہیں لوئیزا کے مکان پر لفٹنٹ روشر کا قتل ہوا۔ کسی نے اس کے پیٹ میں کپڑا تراشنے کی قینچی گھونپ دی تھی۔ لوئیزا جنگلوں میں بھاگ گئی۔ اور اب وہ دشمن کے گوریلا سپاہیوں کے ساتھ ہے۔ حضور میرا خیال ہے۔ کہ اس بغاوت کا رکن اعلیٰ میتر ہے۔ اور جب تک اس کا سر نہیں کچلا جاتا۔ اس علاقے میں کبھی امن و امان قائم نہیں ہو سکتا۔

میجر۔ امن و امان؟ کیا تمہارا خیال ہے کہ اس کے بعد —— اسی گرفتاری کے بعد —— امن و امان قائم ہو جائے گا۔

ولیم۔ (سلوٹ کرتا ہے) حضور میں ایک سپاہی ہوں۔ میرا کام رپورٹ کرنا ہے اور اپنے بڑے افسروں کا حکم ماننا ہے۔

کرنل۔ کیپٹن ولیم تم درست کہتے ہو۔ (وقفہ) میجر کیا بات ہے تم تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔ کیا رات بھر سوئے نہیں۔

میجر۔ ہاں پل کا نقشہ تیار کرتا رہا۔

کرنل۔ میں ان بدمعاشوں کا ابھی بندوبست کرتا ہوں، کیپٹن ولیم، جاؤ میتر اور اس کے دوست ڈاکٹر دونوں کو گرفتار کر کے حراست میں لے لو۔

ولیم۔ یس سر!

منظر ہشتم

(میئر کی خواب گاہ، میئر بسترِ علالت پر دراز ہے، ڈاکٹر اس کے قریب ایک کرسی پر بیٹھا ہے)

میئر۔ یہ بیماری اور ـــــ گرفتاری (کھانستا ہے)

ڈاکٹر۔ آپ باتیں نہ کیجئے۔ آرام سے لیٹے رہیئے۔

میئر۔ اب تو چلنے کی تیاری ہے۔ آخر یہ دن بھی تو (کھانستا ہے) یہ دن بھی آنا تھا۔ (کھانستا ہے) میں حیران ہوں، انہوں نے تمہیں کیوں گرفتار کیا۔ شاید میرے بعد وہ تمہیں...... (مادام داخل ہوتی ہے)

ڈاکٹر۔ آپ کے بعد؟...... آپ آرام سے لیٹے رہیئے!

مادام۔ بات کیا ہے۔ آپ آج کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں کہتی ہوں آپ ان لوگوں سے کیوں جھگڑا مول لے رہے ہیں۔ (وقفہ) مجھے تو کرنل شافٹ، کوئی بُرا آدمی معلوم نہیں ہوتا۔ اور پھر اب ہمیں ان لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنا ہوگا۔ ورنہ وہ مصیبت آئے گی۔ وہ مصیبت آئے گی.... (میئر کا ماتھا چھو کر) بخار تو اب ہلکا ہے ڈاکٹر۔

ڈاکٹر۔ (تشفی دیتے ہوئے) ہاں مادام میئر بہت جلد اچھے ہو جائیں گے۔

مادام۔ میں جاتی ہوں، مجھے باہر کھڑکیوں پر سیاہ پردے لگوانے ہیں۔ جب سے یہ انگریزی بمباروں نے حملے شروع کئے ہیں۔ ہمیں اب کھڑکیوں پر سیاہ پردے بھی ——

(چلی جاتی ہے)

میئر۔ (جذباتی لہجے میں) اسے معلوم نہیں کہ عمر بھر اب اُسے سیاہ پردوں میں رہنا ہوگا۔ (وقفہ) ڈاکٹر کبھی کبھی تو میں بالکل بزدل ہو جاتا ہوں موت کا خیال آتے ہی جی چاہتا ہے، یہاں سے بھاگ نکلوں، دشمن سے معافی مانگ لوں، کرنل کے پاؤں پکڑ لوں۔ اور گڑگڑا کر اپنی جاں بخشی کرا لوں۔ (کھانستا ہے)

ڈاکٹر۔ لیکن یہ تو محض تخیّل ہے۔ تخیّل اور عمل میں بہت فرق ہے۔

میئر۔ لیکن ڈاکٹر ان باتوں کا خیال کرنا بھی گناہ ہے۔

ڈاکٹر۔ ہم سب انسان ہیں۔

میئر۔ مجھے کچھ پتہ نہیں۔ (وقفہ) اور میں تو ایک چھوٹا سا حقیر انسان ہوں۔ یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ لیکن میں سوچتا ہوں۔ ڈاکٹر! کہ ایک چھوٹے سے شہر، ایک چھوٹے سے انسان کے اندر بھی آگ کا وہ شرارہ موجود رہتا ہے، جو موقعہ پانے پر شعلہ جوّالہ بن کر چاروں طرف پھیل سکتا

ہے۔

ڈاکٹر۔ تمہاری مثال فرانس کی آزادی کا بیّن ثبوت ہے، میئر کو کوئی گرفتار نہیں کر سکتا، میئر تو ایک خیال ہے، جسے آزاد شہریوں نے اپنی روحوں سے تخلیق کیا ہے، وہ زندۂ جاوید ہے۔

میئر۔ (سوچتے ہوئے) لوگوں کو کیسے پتہ چل گیا کہ انہوں نے مجھے گرفتار کر لیا ہے، کوئی باقاعدہ اعلان تو ہوا نہیں۔

ڈاکٹر۔ یہی، بڑے اچنبھے کی بات ہے۔ میئر، میں دیکھتا ہوں، کہ سچائی کو بالآخر کوئی نہیں دبا سکتا، جھوٹ، پراپیگنڈا۔ فوج، پریس سنسر، سچائی ایک ایسی شے ہے۔ جو ان سب حصاروں کو توڑ کر باہر آجاتی ہے اور اور عوام کے دلوں میں سما جاتی ہے۔ کیسی عجیب چیز ہے، یہ سچائی!

(اینی داخل ہوتی ہے)

اینی۔ آپ نے مجھے بُلایا ہے۔

میئر۔ ہاں اینی دیکھو (کھانستا ہے) دیکھو —— (وقفہ) تم تو سب کچھ جانتی ہو۔

اینی۔ (حزیں انداز میں) ہاں میئر —— جی ہاں۔ میئر!

میئر۔ دیکھو، مادام کو کچھ نہ بتانا —— اور مادام کے پاس رہنا۔ جب تک جب تک۔ کہ ——

اینی۔(سسکیاں لیتے ہوئے) بہت اچھا..... میٹر (چلی جاتی ہے)

(وقفہ)

ڈاکٹر۔لیکن وہ تمہیں اس بخار کی حالت میں کیسے لے جائیں گے۔

میٹر۔یہ لوگ وقت کے بہت پابند ہیں' (وقفہ) ان لوگوں کا ایک وقت ہے' ایک فوج ہے' ایک لیڈر ہے' ایک رائے ہے' اس لئے وہ سمجھتے ہیں کہ ہم لوگ بھی انہی کی طرح ہیں اور جب وہ ہمارے لیڈر کو مار ڈالیں گے' ہماری فوج کو شکست دے دیں گے تو انہیں فتح نصیب ہو گی۔ہم نہ سوچ سکیں گے' نہ کام کر سکیں گے' نہ آزاد ہو سکیں گے' وہ یہ نہیں جانتے کہ ہماری قوم کے کئی سر ہیں۔جب ایک سر کٹ جاتا ہے تو دوسرا سر سوچنے اور کام کرنے لگتا ہے۔ (کھانستا ہے)

ڈاکٹر۔گیارہ بجے کا وقت دیا تھا انہوں نے۔اگر گیارہ بجے تک حادثے نہ رکے تو۔

میٹر۔تمہارا خیال ہے کہ حادثے رک جائیں گے؟

ڈاکٹر۔(ناامید ہو کر) ابھی تک تو کسی حادثے کی اطلاع نہیں آئی۔

میٹر۔(پر امید لہجے میں) ابھی گیارہ بھی تو نہیں بجے۔(کلاک کی طرف دیکھتا ہے) ڈاکٹر یاد رکھو۔(کھانستا ہے) میری موت بھی ان حادثوں کو نہیں روک سکتی۔میری حیات اب قوم کی بہتری کے لئے ایک رکاوٹ ہے

لوگوں کو اپنا کام کرنا چاہیئے۔ ہر لحظہ ہر لمحہ۔

(دھماکوں کی آوازیں آتی ہیں۔ چند وقفوں کے بعد، کلاک گیارہ بجاتا ہے)

ڈاکٹر۔ لوگوں نے اپنا کام بند نہیں کیا۔
میئر۔ میں خوش ہوں، ڈاکٹر، میں بہت خوش ہوں۔ (آنکھیں بند کر لیتا ہے)

(کیپٹن ولیم داخل ہوتا ہے۔ چند سپاہی اور لفٹنٹ رسن برگ ساتھ ہیں)

کیپٹن ولیم۔ ابھی ابھی دو حادثوں کی اطلاع آئی ہے، جس میں ہماری فوج کے کرنل اور میجر جان سے مارے گئے ہیں۔ (وقفہ) مسٹر میئر اور ڈاکٹر! میں تم دونوں کو بہ حیثیت کمانڈرِ اعلیٰ، بغاوت اور نقصان رسانی کے جرم میں سزائے موت دیتا ہوں۔ سپاہیو! انہیں لے جاؤ، اور شہر کے بڑے چوک میں لیجا کر لوگوں کے سامنے گولی سے ہلاک کر دو۔

ڈاکٹر۔ میئر کو کوئی مار نہیں سکتا۔ وہ ایک خیال ہے جو اس شہر کے بچے بچے کے دل میں سما گیا ہے۔

ولیم۔ کیپٹن رسن برگ! ہوائی دستے کو تیار رکھو۔ میں اس چھوٹے سے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا چاہتا ہوں۔ نہ یہ میئر رہے گا نہ یہ شہر!

(وقفہ)

میئر۔ میرے بھائی، یہ کوئی چھوٹا سا شہر نہیں ہے۔ یہ شہر فرانس ہے!

(پردہ)

ایک نافسطائی کی ڈائری

جب پردہ اُٹھتا ہے۔ تو سٹیج کے وسط میں لیکن بڑے پردے کی زیریں رشنیوں کے بالکل قریب ایک چوبی ڈسک کے سامنے نافسطائی تقریر کر رہا ہے۔ بال ادیبوں کی طرح لانبے اور پریشان، لیکن کنپٹیوں کے قریب سپید ہیں۔ سامنے کے دو دانت غائب ہیں اور دائیں گال پر ایک زخم کا نشان ہے یہ نشان ٹھوڑی کے قریب سے شروع ہو کر رخسار کی ہڈی تک چلا گیا ہے اس طرح کہ جب نافسطائی دورانِ تقریر میں مسکراتا ہے تو یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ وُہ مسکرا رہا ہے یا آنسو بہا رہا ہے۔ نافسطائی کے عقب میں سٹیج بالکل اندھیرے میں ہے۔ صرف نافسطائی کا جسم اور چوبی ڈسک اور اس پر رکھا ہوا مائکروفون اور پانی کا گلاس قوس کی روشنی میں نظر آتے ہیں۔ نافسطائی

تقریر کرتا ہے اور تماشائی گویا اب جلسے کے تماشائی بن گئے ہیں۔

نافسطائی:- میں ایک آسٹروی ادیب ہوں۔ یورپی براعظم کے بہت سے ادیبوں کی طرح میں بھی اپنے خیالوں کے محل میں رہتا تھا۔ قدرت کے پُرکیف، خوبصورت نظارے مجھے شعر کہنے پر آمادہ کرتے تھے۔ زندگی کے حسین و جمیل واقعات مرے ذہن میں نشاط انگیز افسانے بن جاتے تھے۔ میں اپنے مرمریں تصور میں بہت خوش تھا۔ آرٹ، حُسن، مسرت، یہی کلیہ میری زندگی کا محور تھا۔ میری ادبی زندگی کا۔ میری عملی زندگی کا، زندگی کی صعوبتوں اور پریشانیوں سے مجھے کوئی سروکار نہ تھا۔ اقتصادی بے نظمی کی بھوک اور نفرت مجھے چھُو تک نہ گئی تھی۔ یورپی سیاست کی ہیجان انگیزیوں میں میرے لئے کوئی دلکشی نہ تھی۔ جمہوریت، اشتراکیت، فسطائیت۔ یہ نام میرے لئے بے حقیقت تھے۔ بے حقیقت اور غیر دلچسپ، سیاسی لوگوں کے کھلونے، لیکن میری زندگی سے دور، الگ، باہر! (پانی کا ایک گھونٹ پیتا ہے)

پھر میرے ذہن میں، میرے گھڑے گھڑائے نظریوں میں اس وقت بھی کوئی انقلاب پیدا نہ ہوا۔ جب آسٹروی ریاست مسولینی کی سیاست کے زیرِ اثر اپنا چولا تبدیل کرنے لگی۔ جب وی آنا کے اشتراکی دھڑا دھڑ گرفتار کر کے جیلوں میں بھرے جانے لگے۔ جب مُلک میں انتشار اور لوگوں کے دلوں

میں اضطراب پھیلتا گیا۔ اس وقت بھی میرا دل بدستور اپنے رومانی خوابوں کی تکمیل میں مصروف رہا۔ اطالوی سیاست کے بعد نازی جرمنی کی ریشہ دوانیاں میرے وطن میں زور پکڑنے لگیں۔ پولیس کا رویہ زیادہ درشت، زیادہ تیز، زیادہ سخت، اور تحکم آمیز ہوتا گیا۔ آسٹروی چانسلر جلد جلد تبدیل ہونے لگے۔ نازیوں کے اشارے پر ایک آسٹروی چانسلر کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ لیکن میں — اس وقت بھی بدستور حُسن کے راگ گاتا رہا۔ پھر ایک دن آسٹروی جرمن الحاق عمل میں آیا اور میری قوم کی باگ ڈور جرمن نازیوں کے ہاتھ میں دے دی گئی۔

لیکن ان تمام باتوں کا میرے دل پر، میری زندگی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بدستور آرٹ، حسن، مسرت کی تثلیث کی پرستش کرتی رہی۔ کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ میں ایک ادیب ہوں۔ مجھے سیاست، اقتصادیات اور اس قسم کی الم غلم خرافات سے کیا واسطہ، میرا کام تو زندگی کو حُسن کی طلسم آفرینیوں سے معمور کر دینا ہے زندگی کو سدھارنا میرا مقصد نہیں۔ یہ مقصد غیر ادبی ہے، افادی ہے۔ نہ جانے کیا ہے! (پانی کا ایک گھونٹ پیتا ہے اور کھانستا ہے)

پھر مجھے سولہ اپریل کی وہ حسین شام یاد آتی ہے۔ جب میں اور میرا دوست فرانز اور روسٹن اور چند اور ادیب وی آئینا سے باہر ایک پک نک پر گئے تھے۔ ہنسی مذاق، خوش فعلیاں، صنوبروں پر ڈوبتے ہوئے سورج کا سونا۔ دور آسمان کی جھیل میں بادلوں کی نازک نازک سپید سپید بطیں اور وہ کہستانی رستوران میں سامنے

میں بیٹھ کر کافی پیتا . . . . آہ! وُہ دن . . . .

آخری فقرے پر فیڈ آؤٹ ہوتا ہے۔ ہال میں تاریکی ہو جاتی ہے۔ نامسطائی کے جسم کے گرد روشنی کی قوس غائب ہو جاتی ہے اور تاریکی میں رسٹوراں کی آوازیں اُبھر آتی ہیں۔ جب سٹیج پر دوبارہ آہستہ آہستہ فیڈ اِن ہوتا ہے۔ تو ایک کہستانی رسٹوران کا برآمدہ نظر آتا ہے جس میں بید کی بنی ہُوئی کرسیوں پر چند ادیب باتیں کرنے میں مشغول نظر آتے ہیں۔ ادیبوں کی میز سے پرے ایک ویٹر مودّب انداز میں کھڑا ہے۔ نامسطائی ادیب بھی شریکِ محفل ہے۔

فرانز:۔ زندگی کے متعلق ہمارا نظریہ کچھ بھی ہو۔ افادی یا غیر افادی، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زندگی کے ہر نظام میں شخصی آزادی کے حق کو مسلمہ سمجھا جانا چاہئیے۔

روسٹن:۔ شخصی آزادی سے تمہارا کیا مطلب ہے؟

فرانز:۔ یہی آزادی تحریر و تقریر، اپنے مُلک کی سیاست پر رائے زنی کرنے کی آزادی، سوچنے سمجھنے اور دوسرے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کی آزادی اپنے گھر میں اپنی مرضی سے رہنے کی آزادی۔

روسٹن:۔ (طنزیہ) خوب! ہنسنے کی آزادی، مذاق اُڑانے کی آزادی، شہد کھانے کی آزادی، پک نک پر جانے کی آزادی۔

(ادیب قہقہہ لگاتے ہیں)

آٹو:۔ (فرانز سے) تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ اب شخصی آزادی کا دور نہیں، اجتماعی غلامی کا رواج پڑ چکا ہے۔ ریاست سب کچھ ہے۔ فرد کچھ نہیں جیسی طرح ریاست کہے اسی طرح سوچو، سمجھو، لکھو، بولو، ہنسو۔ یہاں تک کہ جس طرح اور جس طریقے سے ریاست شہد کھانے کو کہے۔ اسی طرح شہد کھاؤ۔ جس طرح وہ پک نک پر جانے کو کہے۔ اسی طرح پک نک پر جاؤ۔

فرانز:۔ آج کے اخبار میں یہ پڑھ کر بہت ہی رنج ہوا کہ تھامس مان کی ساری کتابیں ملک میں ممنوع قرار دی گئیں۔

نافسطائی ادیب:۔ (حیرت سے) تھامس مان کی کتابیں؟ سچ کہتے ہو؟

فرانز:۔ کیا تم نے آج کا اخبار نہیں پڑھا (وقفہ) اوہ، معاف کرنا، خوب یاد آیا۔ تم تو سرے سے اخبار پڑھنے کے قائل ہی نہیں ہو۔ اخبار پڑھنا بھی ایک غیر ادبی، اور افادی حرکت ہے نا (ہنستا ہے۔ پھر نافسطائی ادیب کے شانے پر ہاتھ رکھ کر سنجیدگی سے کہتا ہے) سنو۔ آج تھامس مان کی کتابوں کو جلایا جا رہا ہے۔ کل کو ٹریشر کی کتابوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جائے گا۔ اور پھر ایک دن تمہارا ––– میرے دوست تمہارا بھی یہی حشر ہونے والا ہے۔

نافسطائی ادیب:۔ میرا؟ ––– میں ... میں ––– تو صرف عشقیہ افسانے لکھتا ہوں! (سارے ادیب قہقہہ لگاتے ہیں)

آٹو: خش.... روسٹن! غالباً وہ ویٹر ہماری باتیں سُن رہا ہے۔

روسٹن: سُن رہا ہے تو کیا ہوا۔ وہ بھی آسٹروی ہے۔ میں بھی آسٹروی ہوں۔ اور ابھی آسٹروی جرمن الحاق اتنا مضبوط نہیں ہوا کہ اس کی بنا پر ایک آسٹروی دوسرے آسٹروی کے خلاف مخبری کرے اور میں تو یہ کہنے کو بھی تیار ہوں کہ....

آخری فقرے پر فیڈ آؤٹ ہو جاتا ہے۔ اسٹیج پر تاریکی چھا جاتی ہے اور جب دوبارہ آہستہ آہستہ فیڈ ان ہوتا ہے تو وہی پہلی قوس اُبھر آتی ہے اور اس میں ادیب تقریر کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

نافسطائی ادیب: لیکن بے چارے آسٹن کو یہ معلوم نہ تھا کہ گو آسٹروی جرمن الحاق نیا نیا تھا۔ فسطائیوں کے ایجنٹ ہمارے ملک میں بہت پہلے سے پہنچ چکے تھے اور ملک کے ہر شعبے پر حاوی ہو چکے تھے۔ میں آج بھی نہیں جانتا کہ یہ کیسے ہوا؟ کیونکر ہوا؟ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اُسی سولہ اپریل کی سہانی رات کو دو بجے کے قریب، اس کہستانی ہوٹل میں ہم سب ادیبوں کو گرفتار کر کے برگسٹن کے بندی خانے میں پہنچا دیا گیا۔ فرانز کی زبان کی اک ذرا سی لغزش نے ہماری زندگی کا رُخ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بدل دیا۔ برگسٹن کے بندی خانے میں....

اسٹیج پر فوراً اندھیرا چھا جاتا ہے اور پس منظر میں آہ و بکا کی آوازیں بلند

ہوتی ہیں۔ یہ بہت دھیمی آوازیں ہیں اور ان میں اک دردناک نغمے کا ڈھنگ موجود ہے۔ اس لئے آوازوں میں یکسانیت پیدا ہونا ضروری ہے۔ ان آوازوں پر سپاہیوں کے قدموں کی فوجی چاپ سُنائی دیتی ہے۔ ایک لاری کے ٹھہرنے کی آواز آتی ہے۔ ایک سپاہی اندھیرے ہی میں کہتا ہے "ہالٹ ہُوکمز دیر؟" اور ان الفاظ کے ساتھ ہی اسٹیج پر روشنی ہو جاتی ہے۔ اسٹیج پر برگسٹن کے بندی خانے کا وہ دفتر دکھایا گیا ہے جس میں باہر کے آنے والے قیدیوں کا پہلی بار معائنہ کیا جاتا ہے۔ اسٹیج کے دائیں کونے میں لوہے کی سلاخوں کے جنگلے کے قریب ایک لاری کا صرف انجن نظر آ رہا ہے۔ لوہے کی سلاخوں کے اندر کمرے میں ایک گنجا آدمی بیٹھا ہے اور کاغذ اُلٹ پلٹ کر رہا ہے۔ اس کے دو نائب مودّب کھڑے ہیں۔ لاری کے قریب سے ایک حفاظتی گارد میں آسٹروی ادیب آ رہے ہیں اور حفاظتی گارد کے کمان افسر کے ساتھ اس دفتر میں داخل ہو کر ایک قطار میں کھڑے کر دیئے جاتے ہیں۔

گنجا جرمن:۔ (کاغذ اُلٹ پلٹ کرتے ہُوئے) ہُم۔ بارک نمبر آٹھ (نگاہ اُوپر اٹھاتا ہے۔ گارد کا کمان افسر سلوٹ کرتا ہے)

لفٹنٹ:۔ ہائیل ہٹلر! میں لفٹنٹ فرینک فرٹز دیر ہوں۔ تیسرے ایس ایس سپیشل ٹرپ کا کمان افسر! (ادیبوں کی طرف اشارہ کر کے) یہ

لوگ برچیس کے ہوٹل سے گرفتار کیے گئے ہیں۔

گنجا جرمن:۔ ہم

لفٹنٹ:۔ یہ سب باغی ادیب ہیں

گنجا:۔ ہم . . . کتنے آدمی ہیں۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، ساتھ، آٹھ، نو ــــ دس آدمی ہیں۔ دو کمرے کافی ہوں گے۔

آٹو:۔ (حیرانی سے) دو کمرے!

فرانز:۔ مگر کس لئے؟ ہمارا گناہ کیا ہے؟ ہم یہاں کیوں لائے گئے ہیں؟

گنجا:۔ خاموش باغی کتو۔ کیا تم آسٹرو جرمن الحاق کے خلاف اپنے بیہودہ خیالات پھیلا کر اپنے وطن سے غداری کا ثبوت نہیں دے چکے ہو۔

فرانز:۔ ہم غدار نہیں ہیں۔ ہم اپنے ملک کے لئے اپنی جان تک قربان کر سکتے ہیں۔

آٹو:۔ (طنزیہ) غالباً یہ کیمپ ایسے ہی لوگوں کے قتل کا امتحان کرنے کیلئے بنایا گیا ہے۔

گنجا:۔ خاموش (کاغذات دیکھتے ہوئے) تمہارا نام آٹو ٹریشر ہے؟

آٹو:۔ جی ــــ

گنجا:۔ جی حضور کہو! ــــ

آٹو:۔ (طنزیہ) بہت اچھا ــــ حضور!

گنجا :- (ہونٹ چبا کر فرانز سے) اور تمہارا ؟

فرانز :- فرانز کپلر

گنجا :- فرانز کپلر اور آٹو ٹریشر تم دونوں اس گروہ کے سرغنے معلوم ہوتے ہو تمہیں آج ٹکٹکی پر بندھوا کر بید زنی کی سزا دی جائے گی۔ تمہیں اور تمہارے سب ساتھیوں کو!

روسٹن :- بید زنی ؟ بید زنی ؟ یا اللہ!

ایک ناول نویس :- بید زنی! میرے اللہ! کیا مجھے یہ سزا دی جائے گی کپتان صاحب (ہاتھ جوڑتا ہے)

آسٹن :- ہمت سے کام لو رفیق

ناول نویس :- (گنجے سے مخاطب ہو کر گھگھیائی آواز میں) حضور! میں بے گناہ ہوں۔ مجھے ان لوگوں کے ساتھ یونہی پکڑ لیا گیا ہے۔ میں بے گناہ ہوں۔ میں نے کوئی قصور نہیں کیا ہے۔ حضور میں بالکل معصوم ہوں۔ حضور۔ میں تو صرف عشقیہ یا جاسوسی ناول لکھتا ہوں۔

آسٹن :- (غصے سے) ہمت سے کام لو رفیق۔

گنجا :- خاموش باغی کتے، تو صرف جاسوسی ناول اور عشقیہ افسانے لکھتا ہے نا! اور دوستوں کی محفل میں بیٹھ کر حکومت پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ پاجی! لے جاؤ اسے بھی اور اس کی پیٹھ پر پچاس درے لگاؤ۔

ناول نویس :۔ (گڑگڑا کر) حضور مجھے چھوڑ دیجئے۔ میں بالکل بے گناہ ہوں سرکار۔ میں نہ فاسی ہوں۔ نہ غیر فاسی۔ نہ افادی ادیب۔ نہ غیر افادی ادیب مجھے سیاست اور اقتصادیات سے کوئی سروکار نہیں۔ میں صرف عورتوں اور پھولوں کے متعلق شعر کہتا ہوں۔ صرف عشقیہ افسانے لکھتا ہوں۔ میرے ناولوں میں سیاست سرے سے ہے ہی نہیں۔ حضور مجھ پر رحم کیجئے۔ میں تو صرف جاسوسی ناول لکھتا ہوں۔ طلسم دلربا۔ سارے خاندان کا قتل، بڑی دیدی کی موت، نو لکھا ہار، سرسوں کی پھلی۔ ان میں سے کسی ایک میں بھی بغاوت کا شائبہ تک نہیں۔

گنجا :۔ (سپاہیوں سے) لے جاؤ اسے بھی!

(دفتر کے عقبی دروازے سے ادیب اندر دھکیلے جاتے ہیں۔ ناول نویس ابھی تک گڑگڑا کر اور رو کر کہتا جاتا ہے)

ناول نویس :۔ حضور — میں صرف جاسوسی ناول لکھتا ہوں۔ صرف جاسوسی ناول... ہائے!

ناول نویس کی آخری چیخ و پکار پر یہ منظر فیڈ آؤٹ ہوتا ہے اور اک دقفے کے بعد وہی پہلا منظر "فیڈ ان" ہوتا ہے۔ نافسطائی ادیب تقریر کر رہا ہے۔

نافسطائی ادیب :۔ (طنزیہ ہنسی سے) صرف جاسوسی ناول! — میں بھی

پہلے صرف عشقیہ افسانے لکھا کرتا تھا۔ لیکن برگسٹن کے بندی خانے نے مجھے سکھا دیا کہ زندگی عشقیہ افسانوں اور جاسوسی ناولوں سے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہے اور اُس کی وسعتوں میں جہاں حسن کے نخلستان آباد ہیں۔ وہاں اکثر جگہوں پر انسانی شہادت اس طرح مصروفِ پیکار ہے کہ ان حسین نخلستانوں کے مٹ جانے کا بھی اندیشہ ہے۔ محض عشق کی خاطر سہی، محض تحفظِ حُسن کے لئے سہی، . . . ہر ادیب کے لئے یہ ضروری ہے کہ وُہ زندگی کی دوسری حقیقتوں سے آنکھ بند نہ کرلے۔ ورنہ —— وُہ ایک نہ ایک دن اپنے آپ کو برگسٹن کے بندی خانے میں پائے گا۔

برگسٹن کے بندی خانے میں ہم نے کیا دیکھا اور کس طرح میں اور روسٹن وہاں سے بھاگ نکلے۔ اس تلخ داستان کی ہوشربا تفصیلات پھر کسی دن کے لئے اُٹھا رکھتا ہوں۔ اس وقت تو صرف یہی احساس ہے کہ اس سولہ اپریل کی سُہانی شام کی پِک نک نے میرا مرمریں تخیّل ہمیشہ کے لئے مسمار کر دیا اور میں زندگی کی ننگی شاہراہ پر چلنے اور اُس کی تلخ اور غیر لافانی حقیقتوں پر غور کرنے کے لئے مجبور ہو گیا۔

(پانی کا ایک گھونٹ پیتا ہے)

برگسٹن کے جہنّم زار سے بچ نکلنے پر میں اور روسٹن آسٹریا کی سرحد کو پار کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ چھپتے چھپاتے، بھیس بدلتے ہوئے، راتوں

کو سفر کرتے ہوئے اپنے دوستوں، حلیفوں اور اشتراکیوں کی مدد سے ہم آخر آسٹریا کی سرحد پر پہنچ گئے۔ یہاں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ایک بیوہ عورت ہماری میزبان!

بدستور سابق منظر فیڈ آؤٹ ہوتا ہے۔ نافسطائی ادیب کے گرد روشنی کی قوس غائب ہو جاتی ہے اور چند وقفے گھُپ اندھیرا رہنے کے بعد اسی اندھیرے میں دروازے پر دستک کی آوازیں آتی ہیں۔ یہ دستک بڑے زور سے ہوتی ہے۔ پھر اس اندھیرے ہی میں اک عورت کی آواز سنائی دیتی ہے: "کون ہے — کون ہو تم"۔

اندھیرے ہی میں جواب ملتا ہے: "دروازہ کھولو"۔

عورت ایک کونے میں لیمپ جلاتی ہے اور اس لیمپ کی روشنی سے دُوسرا منظر آہستہ آہستہ فیڈ ان ہوتا ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ ہے۔ لکڑی کا فرش ہے۔ عورت ادھیڑ عمر کی ہے۔ لباس بوسیدہ، آواز اور آنکھوں میں حزن و ملال، لیکن عورت کی ٹھوڑی بہت مضبوط ہے اور لب بار بار تیزی سے اور سختی سے اندر کی طرف بھینچ جاتے ہیں۔ مٹھیاں بار بار کستی ہے اور کھول دیتی ہے۔ "دروازہ کھولو" کی صدائیں آتی رہتی ہیں۔ عورت ایک نظر سے چاروں طرف دیکھ کر لیمپ ہاتھ میں لے کر بائیں طرف بڑھ کر دروازہ کھولتی ہے۔ گسٹاپو کے چند آدمی اسے دھکا دے کر داخل ہوتے ہیں۔

عورت:۔ (پیچھے ہٹتے ہوئے) کیا ہے؟ اتنی رات گئے بھی تم لوگ آکر سراسر پریشان کرو گے؟

گسٹاپو کا افسر:۔ مادام! ہم دو — دو اجنبیوں کی تلاش میں ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ وُہ آج اسی گاؤں میں داخل ہوئے ہیں۔

عورت:۔ (تلخی سے) دیکھ لیجئے۔ اچھی طرح سے دیکھ لیجئے۔ میرا مکان تو بالکل خالی ہے۔ اب اس جھونپڑے میں میرے سوا اور کون رہے گا۔ خاوند پچھلی جنگ میں مرگیا۔ دونوں بیٹے اشتراکی نکلے۔ خدا ان اشتراکیوں کو غارت کرے وُہ دونوں آج جیل میں پڑے اپنے گناہوں کی سزا بھگت رہے ہیں۔ ... ہائیل ہٹلر!

گسٹاپو کا افسر:۔ (ہاتھ اُٹھا کر) ہائیل ہٹلر۔ (سپاہیوں سے مخاطب ہو کر) سپاہیو! چلو یہاں سے ... اوہ سارا گاؤں چھان مارا۔ کہیں پتہ نہیں چلتا۔ چلو اب سرحد پر مورچوں کی نگہبانی کرو۔ ہماری مشین گنوں اور کتوں سے بچ کر وُہ لوگ نہیں جا سکتے ... اب مزے سے سوجا بڑھیا!

(وہ چلے جاتے ہیں۔ بڑھیا دروازہ بند کر کے دانت کٹکٹاتی ہے۔ کنڈی لگا دیتی ہے اور لیمپ ہاتھ میں لے کر آہستہ سے لکڑی کے فرش تک مخصوص انداز میں "کھٹ کھٹ" کی آواز پیدا کرتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد لکڑی کے فرش کے وسط میں ایک تہہ خانے کا پٹ اُوپر اُٹھتا ہے اور روشن اور

نافسطائی ادیب کے چہرے لیمپ کی روشنی میں نظر آتے ہیں۔

عورت:۔ (لیمپ جلاتے ہوئے) آجاؤ، باہر نکل آؤ۔ وُہ لوگ چلے گئے ہیں۔

(روسٹن اور نافسطائی ادیب باہر نکل آتے ہیں۔ روسٹن کے قدم لڑکھڑا جاتے ہیں)

روسٹن:۔ اوہ...... اس تہ خانے میں کتنی سردی ہے!

عورت:۔ لیکن اس تہ خانے کی سردی نازی گولیوں کی موت سے تو بہتر ہے نا اس جیل خانے کے حبس سے تو بہتر ہے۔ جہاں میرے دونوں بچے سڑ رہے ہیں مشین گن کی اس گولی سے تو اچھی ہے جس کا شکار میرا خاوند ہُوا تھا (سسکی لے کر)

اس وقت میری عمر --- صرف بیس سال کی تھی (اپنے آنسو پونچھتی ہے)

نافسطائی ادیب:۔ ہمیں معاف کر دو مادام۔

عورت:۔ نہیں... یہ تو --- یہ تو --- ایک عورت کی کمزوری ہے۔ ... یہ آنسو... ہماری نسوانی کمزوری ہے کامریڈ... تم نہیں جانتے مجھے ان فاسی سپاہیوں کو دیکھ کر کتنی وحشت ہوتی ہے۔ انہیں دیکھ کر میرے سامنے اس نئی بربریت کی پُوری تصویر کھنچ جاتی ہے۔ جس کی مہیب پرچھائیں آج سارے یورپ پر منڈلا رہی ہے... اس آدرش کا خیال آتا ہے جس کی تکمیل میں فاسزم سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جس کے لئے ہیں

اور میرے بچے . . . اور . . .

روسٹن :۔ مادام . . . تم تو ___ معاف کرنا۔ وعظ کرنے لگیں۔ لیکن ہمیں ___ معاف کرنا ___ اس وقت اپنی جان کے لالے پڑے ہیں۔ اب تو یہ بتاؤ کہ سرحد پار کرنے کی کیا سبیل ہو گی؟

عورت :۔ انہیں شبہ ہے کہ تم اسی گاؤں میں کہیں چھپے ہوئے ہو۔ لیکن وہ اس مکان کے تہہ خانے کی موجودگی سے واقف نہیں (وقفہ) نہیں تو اب تک کئی مفرور فاسیوں کی گولی کا نشانہ بن چکے ہوتے . . . . میرا خیال ہے۔ اب وہ لوگ سرحد پر اپنی کمین گاہوں میں چھپے تمہاری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔

نافسطائی ادیب :۔ میرے اللہ اب کیا ہوگا؟

عورت :۔ اس سرحد کو تو اب پار کرنا ہی پڑے گا۔ اس طرف فسطائیت ہے۔ دوسری طرف زندگی، آزادی، خوشی۔ شاید ان کے حصول کے لئے تمہیں موت کے دروازے سے بھی گزرنا پڑے!

روسٹن :۔ پھر وعظ کرنے چلیں مادام۔ خدا کے لئے کوئی ترکیب بتاؤ۔ یہاں سے بھاگ نکلنے کی!

عورت :۔ رات کے دو بجے میں تمہیں ایک خفیہ راستے سے سرحد پر لے چلوں گی (طنزیہ ہنسی) ہمیں امید کرنا چاہئے کہ اس وقت نازی سو رہے ہوں گے

ایک نافسطائی کی ڈائری

شکاری کتے زنجیروں سے بندھے کان لپیٹے اُونگھ رہے ہوں گے اور مشین گنیں خاموش ہوں گی ... رات کے دو بجے ... !

آخری الفاظ پر فیڈ آؤٹ ہوتا ہے اور چند وقفوں کے بعد اندھیرے میں ایک بڑا کلاک کہیں دور سے دو بجاتا ہے۔ اس کے بعد پھر چند ساعتوں کا وقفہ جس کے بعد خشک پتوں پر چلنے کی آوازیں آتی ہیں۔ کتے زور زور سے بھونکنے لگتے ہیں۔ پھر چند فائروں کی آوازیں ایک چوکی سے دوسری چوکی تک گونجتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ پھر یہ گونج بھی رات کی خاموشی میں گم ہو جاتی ہے۔ چند لمحے اور اندھیرا رہتا ہے اور پھر فیڈ ان شروع ہوتا ہے اور وہی پہلا منظر سامنے آتا ہے۔ نافسطائی ادیب تقریر کر رہا ہے

نافسطائی ادیب :- روسٹن کی ٹانگ میں دو گولیاں لگیں اور وہ عمر بھر کے لئے لنگڑا ہو گیا۔ لیکن پھر بھی میں اور روسٹن، گسٹاپو اور نازی کتوں کے پنجے سے بچ کر سرحد پار کر آئے۔ یہ کس طرح ہوا، کیونکر ہوا۔ بس میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ غالباً اس میں ہماری چالاکی اور ہوشیاری کو اتنا دخل نہ تھا۔ جتنا محض اتفاق کو یا ہماری خوش بختی کو، بہر حال اس خوش بختی نے بھی بہت دیر تک ہمارا ساتھ نہ دیا۔ کیونکہ یورپ میں فاسی طوفان بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ آسٹریا، چیکوسلوویکیا، پولینڈ، ہالینڈ، ناروے یکے بعد دیگرے یورپی قوموں پر فاسیوں کا پنجۂ استبداد مسلّط ہوتا گیا۔

جہاں جہاں فاسی پہنچے۔ ہم لوگ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوتے۔ کیونکہ ہمیں اچھی طرح معلوم تھا کہ فاسی جہاں جاتے ہیں۔ وہاں خالی اپنے عسکری نظام کی نمائش نہیں کرتے بلکہ گستاپو، بندی خانے اور ان تمام وحشی اور بربری لوازمات کی بھی نمائش کرتے ہیں کہ جن کے بغیر کوئی فاسی نظام زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا۔

یورپ کے مختلف ملکوں سے آزادی پسند لوگ بھاگ رہے تھے۔ حریت پسند اور شہریت کے آدرش میں اعتقاد رکھنے والے لوگ، ان میں ابراہیمؑ کے فرزند بھی شامل تھے اور اسماعیلؑ کے بھی، اپانو کے اور مسیحؑ کے بھی۔ یہ وہ لوگ تھے۔ جنہوں نے عمر بھر سیاسی ظلم اور اقتصادی بیرحمی کے خلاف جنگ کی تھی اور آج فاسی طوفان سے بچنے کے لئے یورپ کی سنگلاخ سڑکوں پہ آوارہ پھر رہے تھے۔ ان میں یہودی تھے اور کمیونسٹ بھی اور پولش ڈاکٹر اور چیکوسلوویکیا کے سپاہی اور آسٹری ادیب! . . . . چاروں طرف طوفان گرج رہا تھا اور زمین اور آسمان اور سمندر پہ کہیں بھی ان لوگوں کو پناہ نہ ملتی تھی!

(پانی کا ایک گھونٹ پیتا ہے)

یہ تمام لوگ فرانس کا رُخ کر رہے تھے۔ کیونکہ ابھی تک فرانس نازیوں کی دست بُرد سے محفوظ تھا۔ لیکن یہاں بھی سلامتی کتنی غیر یقینی تھی۔ اس کا

احساس ہمیں پیرس پہنچ کر ہوا۔

لفظ "پیرس" پر فیڈ آؤٹ ہوتا ہے اور چند ثانیے کے اندھیرے کے بعد فیڈاِن شروع ہوتا ہے اور فرانسیسی گانے کی مخصوص آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ جب منظر پوری طرح اُجاگر ہوتا ہے تو ایک پیرسی کافے کا باہر کا حصہ نظر آتا ہے جہاں ایک میز کے گرد چند فرانسیسی اور غیر فرانسیسی بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ اس دفعہ لہجے میں وہ بے فکری نہیں ہے جو آسٹروی کوہستانی کافے کے منظر میں پائی جاتی تھی۔ یہاں گفتگو کا انداز زیادہ تلخ ہے۔ لیکن آوازیں دھیمی ہیں اور نگاہوں میں خوف ہے۔ وہ بار بار پلٹ کر اِدھر اُدھر دیکھتی ہیں اور پھر گھوم کر اپنے ساتھیوں پر جم جاتی ہیں۔ پال ریناں ایک فرنچ کٹ ڈاڑھی والا ادھیڑ عمر کا وجیہہ آدمی اپنے باقی ساتھیوں کو مخاطب کر رہا ہے

پال ریناں:۔ موسیو! فرانس کی شکست اب ایک طے شدہ امر سمجھئے۔ فسطائی ایجنٹوں نے عوام اور حکومت کے درمیان شک و شبہات اور بدظنی کی ایک کڑی دیوار حائل کر دی ہے۔ حکومت عوام کی طاقت سے خوفزدہ ہے اور جس طبقے کے ہاتھ میں ملک کی رہنمائی ہے۔ وہ سماجی انقلاب سے خوفزدہ ہو کر فاسی ایجنٹوں سے جا ملا ہے۔ وہ طبقہ شاید یہ سوچتا ہے کہ سماجی انقلاب ہونے پر عوام ان سے ساری طاقت چھین لیں گے۔ لیکن اگر وہ فسطائیت پسندوں سے مفاہمت کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس صورت میں ان کی

طبقاتی برتری بحال کر دی جائے گی۔ ان لوگوں نے اپنے ذاتی مفاد کیلئے
فرانس کو دشمنوں کے ہاتھ بیچ دیا ہے

نافسطائی ادیب:۔ سُنا ہے کہ وارنے میں بھاگے ہوئے غیر ملکیوں کے لئے
ایک بندی خانہ بھی بنا دیا گیا ہے؟

پال:۔ بنا دیا گیا ہے؟ کیا کہتے ہو تم؟ کوئی دن میں تم خود وہاں جانے والے ہو، جانتے ہو۔ وارنے کے بندی خانے میں کون لوگ رکھے گئے ہیں؟
وُہ تمام غیر ملکی شہریت پرست ادیب اور سیاس جنہوں نے انسانی تہذیب کو فسطائیت کی بہیمیت سے بچانے کے لئے عمر بھر جنگ کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
یہ وُہ لوگ ہیں جو کل تک فرانس کے اور سارے آزادی پسند عوام کے ہیرو تھے ۔ ۔ ۔ ۔ آج جیل خانے کی آہنی سلاخوں کے اندر بند کر دیئے گئے ہیں۔ یہ وُہی لوگ ہیں جنہوں نے یورپ میں سب سے پہلے فسطائیت کے خلاف جہاد کا عَلَم بلند کیا تھا اور اب وُہی مجاہد جو کل تک پیرس میں اور دُنیا بھر میں پُوجے جاتے تھے۔ آج وارنے کے بندی خانے میں پڑے سڑ رہے ہیں۔ یہ ہے اسی جہاد کا اختتام جو شہریت کو بچانے کے لئے شروع کیا گیا تھا۔

ایک چیک:۔ (پال سے مخاطب ہو کر) ولی شولز کو جانتے ہو۔ وُہ آسٹروی چھوٹا۔ منحنی آدمی۔ متجسّس آنکھیں، جو ہر وقت بے چین سی دکھائی دیتی ہیں

——وہ بھی آج کل وارنے کے بندی خانے میں قید کر دیا گیا ہے۔

پال :- ارے ہاں . . . . وہ مجھے ایک دن اسی کانفے میں ملا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا (وقفہ)

فیڈ آؤٹ شروع ہوتا ہے۔ لیکن مکمل فیڈ آؤٹ نہیں ہوتا۔ صرف یہ ہوتا ہے کہ پال ریناں کی صورت کے علاوہ باقی سب لوگوں کے چہرے اور منظر کا باقی حصہ بھی اندھیرے میں کر دیا جاتا ہے۔ پال ریناں کرسی پر بیٹھا ہوا تماشائیوں کی طرف مڑتا ہے۔ اتنے میں اس کے داہنی طرف سے ولی شولز آتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور کرسی کھینچ کر اس کے قریب بیٹھ جاتا ہے۔ آنے کا منظر نیم اندھیرے میں ہے! صرف پال اور ولی شولز کے چہروں پر روشنی پڑ رہی ہے۔ ولی شولز کا چہرہ بے حد بھیانک ہے۔ ہڈیاں باہر اُبھر آتی ہیں۔ اس کا چہرہ کسی مُردے کا سا چہرہ معلوم ہوتا ہے۔

پال :- فرانس میں آنے سے پہلے تم کہاں تھے؟

ولی شولز :- ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۳۹ء تک میں آسٹریا میں رہا۔ اپنے گاؤں میں نازیوں کے خلاف دو دفعہ لڑا۔ دونوں دفعہ زخمی ہوا (کھانس کر) ایک دفعہ گولی پھیپھڑوں میں لگی (کھانستا ہے)

پال :- اور اس سے پہلے تم کہاں تھے؟

ولی شولز :- اس سے پہلے میں پیرس میں تھا۔ بیکار اور آوارہ گھومنے والا۔ یہ

۳۵-۱۹۳۶ء کی بات ہے (کھانستا ہے)

پال :- اور اس سے پہلے تم کیا کرتے تھے۔

ولی شولز :- اس سے پہلے میں جرمنی میں تھا۔ بندی خانے میں۔ ۱۹۳۳ء سے لے کر ۱۹۳۵ء تک۔

پال :- اور اس سے پہلے

ولی شولز :- اس سے پہلے میں اپنے پیارے شہر دی آسنا میں تھا۔ بیکار اور انقلابی (کھانستا ہے) یہ ۱۹۳۰ء کی بات ہے۔ اس وقت میری عمر اکیس سال کی تھی۔

پال :- (نیم تاریکی میں بیٹھے ہوئے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر) دوستو۔ یہ ہیں ولی شولز کی زندگی کے دس سال، اس کی جوانی کے دس سال۔ جو بھوک، جلاوطنی، بیکاری اور جیل میں گذرے۔ بعض لوگوں نے صرف پانچ چھ سال ایسے گزارے تھے۔ کئیوں نے بارہ تیرہ سال، لیکن ہر شہریت پرست کی قریباً ایسی حالت تھی۔ کئیوں کو تو اپنی زندگی میں کام کرنے کا موقعہ ہی نہ ملا تھا۔ ہاں چند ایک خوش قسمت افراد کو —— وہ خوش آئند لمحے یاد تھے۔ جب انہیں کسی فیکٹری، کان یا دکان پر غلامانہ کام کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ کوئی اپنے بیوی بچے چھوڑ کر آیا تھا۔ تو کوئی اپنی محبوبہ، ہاں پہلے پہل اس کے خط بھی آتے تھے۔ تین چار

سال تک آتے رہے۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ بندی خانوں کی دنیاؤں میں رہنے والے قیدیوں کا ناطہ باہر کی دُنیا سے بالکل ٹوٹ گیا۔ جمہوریت اشتراکیت، انسانیت؟ —— گندی موری میں پڑا ہوا سگرٹ کا ٹکڑا ان ناموں سے زیادہ بیش قیمت تھا

(ولی شولز اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیتا ہے اور کُرسی سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور پھر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اندھیرے میں گم ہو جاتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد اور اس کے دوران میں بھی پال اپنی تقریر جاری رکھتا ہے اور جونہی ولی شولز اندھیرے میں غائب ہوتا ہے۔ تاریکی آہستہ آہستہ دُور ہوتی جاتی ہے)

پال:- ان لوگوں نے اک مسرّت بھری دُنیا کی تخلیق کرنا چاہی تھی۔ لیکن فرانس کے ناسیوں نے انہیں وارنے کے بندی خانے کی جلتی ہوئی بھٹی میں جھونک دیا ہے۔ ولی شولز کے دونوں پھیپھڑے خراب ہو چکے ہیں اور وُہ اپنی زندگی ہر سانس کے ساتھ اپنا لہو تھوک کر ختم کر رہا ہے۔۔۔ ایک مسرّت بھری دُنیا کی تخلیق؟ —— ولی شولز کا قصور صرف یہی ہے کہ اس نے انسانوں کی برادری کے لئے اک زیادہ خوبصورت، زیادہ پائیدار اور بہتر نظامِ زندگی کی تخلیق چاہی۔۔۔۔ کبھی یہی پیرس ولی شولز اور اس کے ساتھیوں کو پوجتا تھا اور آج انہی لوگوں کو کوڑا کرکٹ سمجھ کر وارنے کے

بندی خانے میں پھینک دیا گیا ہے۔ گلے سڑے آلوؤں کی طرح، بیکار بے مصرف
نہ ان کی کوئی قدر و قیمت ہے نہ ان کا کوئی پُرسانِ حال ۰۰۰۰ !

(پولیس کے سپاہی آ کر پال اور اُس کے ساتھیوں کے گرد گھیرا ڈال لیتے ہیں)

پولیس کا افسر:۔ موسیو۔ آپ لوگ حراست میں ہیں۔

پال اور اُس کے ساتھی اپنی کرسیوں سے اُٹھتے ہیں۔ پولیس کا گھیرا اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے۔ یُونہی لوگوں کو ہتھکڑیاں پہنائی جاتی ہیں۔ سارے کلب میں ہڑ بونگ مچ جاتا ہے۔

آوازیں:۔ آزاد فرانس زندہ باد۔ آزادی، اخوت، مساوات ا زندہ باد!

اسی شور و غل میں فیڈ آؤٹ ہوتا ہے۔ پال اور اُس کے ساتھی جن میں نافسطائی ادیب بھی شامل ہے۔ ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے سٹیج کے بائیں طرف لے جاتے ہیں۔ روشنی بار بار مختلف چہروں پر پڑتی ہے اور مدہم ہوتی جاتی ہے۔ آخر میں مکمل اندھیرا ہو جاتا ہے۔ چند وقفوں کے بعد جب فیڈ ان ہوتا ہے تو وہی پہلا منظر ہے۔ نافسطائی ادیب تقریر کر رہا ہے۔

نافسطائی ادیب:۔ ایک جیل خانے سے دُوسرے جیل خانے تک! زندگی کی یہ ڈگر ان لوگوں کے لئے ہے جو فسطائیت کے عقیدوں کے خلاف جنگ، بیکاری، بھوک، نسلی اور طبقاتی فوقیت کو مٹا دینے پر تلے ہوتے ہیں! کیا ہماری یہ کوشش رائیگاں جائے گی؟ کیا ہماری قربانی انسانی زندگی کو

اک نئی ترتیب دے کر اسے اک نئی شاہراہ پر گامزن نہ کر سکے گی ؟ واہمے کی خوفناک تنہائیوں میں پڑا ہوا ایک آسٹروی ادیب آپ سے اس سوال کا جواب مانگتا ہے!

(پردہ)

بادشاہ

ایک تھا بادشاہ (ہمارا تمہارا خدا بادشاہ!) اور اس کے سات بیٹے تھے اور سات رانیاں تھیں اور سات محل تھے اور سات وزیر تھے۔ ایک دن کرنا خدا کا کیا ہوا ــــ مگر بچو یہ کہانی تم کئی بار سن چکے ہو۔ دنیا کی ہر کہانی بادشاہ سے شروع ہوتی ہے اور شادی پر ختم ہوتی ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں۔ تمہیں آج تک یہ پتہ نہیں کہ بادشاہ کیا ہوتا ہے اور کیوں ہوتا ہے۔ کیوں اس کے سات محل، سات رانیاں، سات بیٹے، سات وزیر ہوتے ہیں؟ اور کیوں ہمارے پاس ایک محل یا ایک وزیر بھی نہیں! آؤ میں آج تمہیں بادشاہ کی کہانی سناؤں بڑی دلچسپ کہانی ہے یہ۔ ذرا الاؤ کے اور قریب آجاؤ!

ہزاروں برس گزرے۔ جب انسان بالکل وحشی تھا اور جنگلوں میں پتھر کی غاروں میں رہتا تھا اور درختوں کی چھال پہنتا تھا۔ اُس زمانہ میں کوئی بادشاہ نہ تھا۔ ہر غار میں ایک انسانی جوڑہ رہتا تھا۔ مرد اور عورت اور اس کے بچّے اس غار میں رہتے تھے اور مل جُل کر کام کرتے تھے۔ شکار گھر کے افراد میں اسی تناسب سے تقسیم ہوتا تھا۔ جس تناسب سے کہ بیوی، بچّوں اور مرد کی ضروریات تھیں۔ سب غار کے فرش پر سوتے تھے۔ درختوں کی چھال سے جسم ڈھکتے تھے اور خدا کا شکر بجالاتے تھے جس نے پانی بنایا۔ اور شکار بنایا۔

ہوتے ہوتے انسانوں نے غاروں میں رہنا چھوڑ دیا اور بہت سے انسانی جوڑے اکٹھے مل کر ایک قبیلہ میں رہنے لگے۔ اب انسانوں نے بھیڑ، بکریاں اور دوسرے پالتو جانوروں کے گلّے پال لئے تھے۔ وُہ تھوڑا بُہت سینا پرونا بھی سیکھ گئے تھے۔ اُون کاتنا بھی۔ اور خیموں میں رہتے تھے یا بڑے بڑے درختوں کے نیچے۔ ہر ایک قبیلے کا ایک سردار ہوتا تھا۔ جو قبیلے کے ہر فرد کی صلاح سے بنایا جاتا تھا۔ قبیلے کا سردار وُہ ہوتا تھا۔ جو سب سے زیادہ عقلمند، طاقتور اور قبیلے کی بھلائی چاہنے والا ہو۔ یہ سردار ہر کڑی بات میں قبیلے کے دوسرے افراد سے صلاح لیتا تھا۔ یوں بھی قبیلے کے ہر فرد کو یہ حق حاصل تھا۔ کہ وُہ جب چاہے۔ سردار پر اپنے خیالات ظاہر کردے۔ اپنی رائے دے۔ ہر بات

ایک جرگہ میں طے پاتی تھی اور قبیلے کے سب لوگ اس پر عمل کرتے تھے اور اپنے سردار کی رہنمائی کو منظور کرتے تھے۔

پھر یہ ہُوا کہ انسان نے کھیتی باڑی کرنا سیکھا۔ اناج بو کر اُسے کاٹنا اور کاٹ کر پکانا سیکھا۔ کھیتی باڑی کرنے سے یہ ہُوا کہ پہلے اُسے ایک جنگل سے دوسرے جنگل اور ایک وادی سے دوسری وادی میں اپنے بھیڑ بکریوں کے گلے کو چرانے کی جو لت تھی۔ وُہ کم ہو گئی۔ اُس نے خانہ بدوشوں کی زندگی ترک کر دی اور مٹی کے گھر بنا کر اپنے کھیتوں کے قریب رہنے لگا۔ چونکہ اس کام میں اُسے بہت سے انسانوں کی مدد کی ضرورت تھی۔ اس لئے چھوٹے چھوٹے قبیلے آپس میں مل کر گاؤں کی بنیاد رکھنے لگے۔ گاؤں میں سماج کا شعور پیدا ہونے لگا۔ اُون کاتنا تو جانتے ہی تھے۔ اب سُوت کاتنا بھی شروع کر دیا۔ اس طرح تقسیم کار کا عمل زیادہ وسیع ہوتا گیا۔ ہل بنانے والے لوہار، مٹی کے برتن بنانے والے کمہار۔ سُوت کاتنے والے جولاہے۔ گاؤں کی رکھوالی کرنیوالے چوکیدار، جھگڑوں پر غور کرنے والے پنچ اور پنچوں کے مقدم ظہور میں آئے۔ ایک ہی وادی میں دس بارہ ایسے گاؤں بن گئے اور پھر ان دیہاتوں نے مل کر اس وادی کی حفاظت اور رہنمائی کے لئے اپنا راجہ چُن لیا . . . بادشاہ (ہمارا تمہارا خدا بادشاہ)

وُہ دن جس دن پہلے بادشاہ کا انتخاب آیا۔ انسان کی زندگی میں بڑا منحوس

تھا۔ کیونکہ جوں جوں تقسیمِ کار کا عمل زیادہ وسیع ہوتا گیا اور سماج کا دائرہ بڑھتا گیا اور زندگی کی ضروریات بڑھتی گئیں۔ ہر شخص اپنے اپنے کام میں زیادہ مشغول نظر آنے لگا۔ کمہار کو، بڑھئی کو، لوہار کو، چمار کو، جولاہے کو، کسان کو اپنے کام سے اس قدر فرصت کہاں تھی کہ وُہ پوری وادی کے نظم و نسق میں اتنی دلچسپی لے سکے۔ بہت ہوا تو وُہ شام کے وقت اپنے گاؤں کی چوپال میں جا بیٹھتا اور الاؤ کے سامنے اپنے گاؤں کے معاملات پر بحث کرتا۔ جوں جوں اُس کے دل سے جنگل کا خوف دُور ہوتا گیا۔ وُہ اپنے گھر کی چار دیواری میں تن آسان ہوتا گیا اور وادی یعنی سلطنت کے نظم و نسق میں اس کی دلچسپی ہر روز کم ہوتی گئی اور پھر ایک بات یہ بھی تھی کہ پہلے پہل جو بادشاہ بنے۔ وُہ واقعی بڑے لائق، قابل اور ہوشیار اور وادی کے بہترین نمائندے ہوتے تھے۔ وُہ اتنے ہی مزدور اور محنتی تھے جتنے کہ وادی کے اور لوگ۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ اب ان کی پُوچھ گچھ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ لگان کس طرح خرچ ہوتا ہے۔ حفاظت کرنے والے چوکیدار دن بھر کہاں رہتے ہیں تو بادشاہ آہستہ آہستہ لوگوں کے زیرِ اثر نہ رہا۔ وُہ مطلق العنان ہو گیا۔ وُہ اپنا درجہ خدا کے بعد سمجھنے لگا۔ سپاہیوں کی مدد سے اپنے لوگوں پر حکومت کرنے لگا۔ وُہ اب بادشاہ تھا۔ لوگ اُس کی رعایا تھے۔ وُہ راجہ تھا۔ اُس کا بیٹا راجکمار۔ چاہے اس کا بیٹا علم و فضل میں، طاقت و ہنر میں، شجاعت و مردانگی میں وادی کے سب افراد سے

بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ وہ بادشاہ کا لڑکا تھا اور شہزادہ تھا اور جب بادشاہ مر گیا۔ تو شاہزادہ تخت پر بیٹھ گیا۔ تخت ایک محل میں تھا جسے بادشاہ نے رعایا کے لگان سے اور اپنی بے ایمانی سے چوکیداروں اور بیگار والوں کی مدد سے وادی کے سب سے اونچے ٹیلے پر تعمیر کرایا تھا۔ تاکہ ساری وادی اس کی زیرِ نظر اور زیرِ اثر رہے۔ اور جب رعایا کی نگاہیں اوپر اٹھتیں تو انہیں بادشاہ کا محل نظر آتا۔ اونچا، بلند پُرشکوہ۔ بادشاہ سچ مچ خدا کے بعد دنیا کی سب سے بڑی ہستی تھی۔ وہ راجہ کو پرنام کرنے لگے۔ جھک کر کورنش بجالانے لگے۔ بادشاہ نے وادی کے باقی چھ ٹیلوں پر محل اور قلعے بنائے۔ سات رانیوں سے اُن محلوں کو سجایا۔ گو دوسرے لوگوں کے گھر میں صرف ایک عورت تھی۔ پر وہ تو بادشاہ تھا (ہمارا تمہارا خدا بادشاہ)

بچو! کہانیوں میں تم جن بادشاہوں کا ذکر سنتے ہو۔ یہ سب بادشاہ اسی طرح بنے ہیں۔ اس وادی کا پہلا بادشاہ اسی طرح بنا۔ باپ کے بعد بیٹا اور پھر اس کا بیٹا۔ بادشاہت جو پہلے لوگوں کی مرضی سے قائم ہوتی تھی۔ اب وراثت بن گئی اور بادشاہ کا درجہ خدا کے بعد قرار پایا۔

اس وقت سے لے کر آج تک وادیوں اور ملکوں اور سلطنتوں پر بادشاہوں کی حکومت رہی ہے۔ نہ صرف کہانیوں میں بلکہ انسانی تاریخ میں بھی۔ بادشاہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ وہ جنگ کر سکتا ہے۔ لاکھوں بندگانِ خدا کا خون کر سکتا ہے

ایک عورت کے لئے، ایک گز زمین کے لئے، ایک انتقامی جذبے کے لئے ایک نمودِ جبر کے لئے۔ وُہ لاکھوں آدمیوں کا خون بہا سکتا ہے۔ وہ بادشاہ ہے اور سات محلوں میں رہتا ہے اور سات رانیاں رکھتا ہے اور سات وزیروں سے صلاح کرتا ہے اور رعایا کو اُس کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔ وہ اب ارضی نہیں عرشی ہے اور بھُول گیا ہے کہ وُہ انہیں جاٹوں اور کسانوں کے طبقے سے پیدا ہوُا تھا اور اُسے وادی کے نظم ونسق کے لئے چُنا گیا تھا۔ مطلق العنانی کے لئے نہیں۔ مگر یہ بادشاہت کسانوں اور وادی کے لوگوں نے اپنی تن آسانی سے نہیں پیدا کی تھی کیا؟

دُنیا کی تاریخ میں بڑے بڑے عجیب بادشاہ ہو گزرے ہیں۔ یوں تو ہر بادشاہ عجیب ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی اگر انہیں غور سے دیکھا جائے تو نہایت آسانی سے ان کی چند قسمیں بنائی جا سکتی ہیں۔ تاریخ نے ہر بادشاہ کو بادشاہ لکھا ہے اور کمہاروں، چماروں، جولاہوں کی طرح ان میں کوئی خاص امتیاز نہیں روا رکھا۔ درآنحالیکہ یہ غلط ہے

میں تمہیں ان دلچسپ بادشاہوں کے قصے سُناتا ہوں۔ ایسے دلچسپ قِصے جو تم نے کسی پریوں کی کہانی میں نہ پائے ہوں گے۔ ان بادشاہوں کی کہانی جو بھُوتوں کی عجیب وغریب داستان سے بھی زیادہ عجیب وغریب ہے۔ اس لئے کان کھول کر سنو۔ ایک تھا بادشاہ (ہمارا تمہارا خدا بادشاہ!)

(۱) سب سے پہلے میں خدا کا ذکر کرتا ہوں جس نے یہ سارا جہاں بنایا۔ ہمارا تمہارا سب کا خدا بادشاہ ہے اور اس بادشاہ نے باقی سب بادشاہ بنائے ہیں۔ چونکہ اس بادشاہ کی مرضی کے بغیر اور کوئی بادشاہ نہیں بن سکتا۔ گویا ایک طرح سے بادشاہت کے لئے خدا کا وجود ضروری ہے۔ اس لئے خدا کو ضروری بادشاہ کہتے ہیں۔

(۲) خدا کے بعد تاریخ میں ان بادشاہوں کا ذکر آتا ہے جو رعایا کی مرضی سے چنے جاتے ہیں اور رعایا کی مرضی سے معزول کر دیئے جاتے ہیں۔ ایک عرصہ تک رومن سلطنت میں ایسے بادشاہوں کی حکمرانی رہی اور دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی ایسے بادشاہ ہوتے رہے۔ ایسے بادشاہوں کو جمہوری بادشاہ کہتے ہیں۔

(۳) اس کے بعد ان بادشاہوں کا دور دورہ ہے جو ایک وادی سے دوسری وادی میں اپنی سلطنت کو لئے گھومتے رہتے تھے اور ساری عمر اسی طرح خانہ بدوش رہ کر گزار دیتے تھے۔ اس قسم میں ایسے بادشاہ بھی شامل ہیں۔ جو رچرڈ شیر دل کی طرح اپنی سلطنت چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں جا جا کر لڑتے جھگڑتے رہے۔ اور ادھر سے اُدھر گھومتے رہے اور زندگی بھر انہیں چین نصیب نہ ہوا۔ ایسے بادشاہوں کو لنگوری بلکہ لنڈوری بادشاہ کہتے ہیں۔

(۴) دُنیا کی تاریخ میں ایک بہت بڑی تعداد ایسے بادشاہوں کی بھی ہے جنہیں دن رات شراب پینے، ناچنے تھرکنے اور چنگ و رباب بجانے کے علاوہ اور کوئی کام نہ تھا۔ جب نادر شاہ دہلی پر یلغار بول رہا تھا تو محمد شاہ رنگیلا کہہ رہا تھا

"این دفترِ بے معنی غرقِ مئے ناب اولیٰ!" دنیا کے ہر ملک میں محمد شاہ رنگیلے گزرے ہیں۔ جنہیں اپنی رعایا سے اتنی محبت نہ تھی۔ جتنی شراب سے۔ ایسے بادشاہوں کو انگوری بادشاہ کہتے ہیں۔

(۵) فیروز تغلق بادشاہ نہ بننا چاہتا تھا۔ لیکن اُسے مجبوراً بادشاہ بننا پڑا۔ وہ تو ایک فقیر منش انسان تھا۔ جسے زبردستی بادشاہ بنایا گیا۔ اسی طرح یدھشٹر بھی اپنے بھائیوں کا خون کر کے بادشاہ نہ بننا چاہتا تھا۔ لیکن پھر بھی اُسے دوسروں کے کہنے پر مہابھارت کی جنگ لڑنا پڑی اور ہندوستان کا بادشاہ بننا پڑا۔ ایسے بادشاہوں کو جو خود بادشاہ نہ بننا چاہتے ہوں بلکہ زبردستی بنائے جائیں۔ مجبوری بادشاہ کہتے ہیں (مجبوری بادشاہ کی ترکیب ذرا غلط ہے مگر کیا کیا جائے مجبوری ہے)

(۶) فیروز تغلق سے محمد تغلق کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ یہ بھی ایک بڑا عجیب و غریب بادشاہ تھا۔ اُس نے دو دفعہ اپنا دارالخلافہ تبدیل کیا اور دونوں دفعہ دارالخلافے کے لوگوں کو فرمانِ شاہی سے ہجرت کرنے کو کہا۔ ہزاروں آدمی اسی طرح ایک دارالخلافے سے دوسرے دارالخلافے کو ہجرت کرتے ہوئے مر گئے۔ اسی طرح جب ایک بار اس کا ایک دانت ٹوٹ گیا تو اُسے اتنا صدمہ ہوا کہ اُس نے اپنے دانت کو دفن کرنے کے لئے ایک عالی شان مقبرہ بنایا جس میں اپنے دانت مرحوم کو بڑے تزک و احتشام سے دفن کیا۔

اس قسم کا ایک بادشاہ کینوٹ انگلینڈ میں بھی ہو گزرا ہے۔ یہ بادشاہ سمندر کے ساحل پر کھڑا ہو کر سمندر کی لہروں کو واپس چلے جانے کا حکم دیا کرتا تھا۔

ہر ملک میں اس قسم کے بادشاہ ہو گزرے ہیں۔ حکماء کا قول ہے کہ ان بادشاہوں کے دماغ میں فتور تھا۔ یہ رائے آج کل کے حکماء کی ہے۔ اگر یہ حکماء ان بادشاہوں کے وقت میں بھی فتوے صادر کرتے تو زندہ گاڑ دیئے جاتے۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ دُنیا میں ہر پاگل انسان کے لئے پاگل خانہ موجود ہے۔ لیکن بادشاہ کے لئے نہیں۔ جب انسان پاگل ہوتا ہے تو اُسے پاگل خانہ میں بند کر دیا جاتا ہے۔ جب بادشاہ پاگل ہوتا ہے تو روم کو آگ لگا دیتا ہے اور خود نیرو بن کر چین کی بنسی بجاتا ہے۔ ایسے بادشاہ جن کے دماغ میں فتور ہو اور جنہیں کسی پاگل خانے میں بند نہ کیا گیا ہو۔ فتوری بادشاہ کہتے ہیں۔

(۷) ایک قسم بادشاہوں کی وُہ بھی ہے۔ جو برائے نام بادشاہ ہوتے ہیں اور دستخط کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے۔ ایسے بادشاہوں کو دستوری بادشاہ کہا جاتا ہے۔

(۸) ایک قسم بادشاہوں کی وُہ بھی ہے۔ جو سب کچھ کر سکتے ہیں۔ دستخط نہ کرنے کے سوا اور سب کچھ کر سکتے ہیں۔ دُنیا کو جڑ سے ہلا دیتے ہیں اور براعظموں کو تاخت و تاراج کرتے پھرتے ہیں۔ ایسے بادشاہوں کو تیموری[1] بادشاہ کہا جاتا

[1] "تیموری" یہاں بطور اسم صفت استعمال کیا گیا ہے۔

ہے۔ مثال کے طور پر تیمور، چنگیز خاں، ہلاکو کبلا خان!

(۹) آپ نے تاریخ میں ایسے بادشاہوں کا بھی حال پڑھا ہوگا۔ جو بادشاہ ہوتے ہوتے رہ گئے ہیں۔ یعنی یہ کہ تاجپوشی ہونے والی تھی۔ لیکن عین اُسی وقت کریال میں غلّہ لگا اور بادشاہ سلامت بادشاہ ہوتے ہوتے رہ گئے۔ ایسے بادشاہوں کو اُدھوری بادشاہ کہتے ہیں۔ نام لینا بے کار ہے۔ تاریخ پڑھئے!

(۱۰) اس قسم میں وُہ بادشاہ شامل ہیں جو دو بڑے بادشاہوں کے درمیان آئیں۔ جنہیں چند دن، چند ماہ یا چند لمحے کی بادشاہت نصیب ہو انہیں عبوری بادشاہ کہا جاتا ہے۔ اکثر اوقات یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ خود بادشاہ نہیں ہوتے۔ بلکہ بادشاہ کوئی اور ہوتا ہے اور یہ لوگ محض ایک کٹ پتلی ہوتے ہیں۔ ایسے موقع پر کٹ پتلی کو تو عبوری بادشاہ اور کٹ پتلی کے پیچھے جو جادوگر چھُپا ہوتا ہے۔ اُسے مستوری بادشاہ کہتے ہیں۔

(۱۱) آخری قسم میں وُہ بادشاہ شامل ہیں جو سینکڑوں برس زندہ رہتے ہیں اور مرنے میں نہیں آتے۔ رعایا، دُنیا، ان کے وزیر، ان کے گھر کے افراد سب لوگ ان سے پریشان ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ بادشاہ جئے جاتے ہیں۔ سلور جوبلی گولڈن جوبلی، ڈائمنڈ جوبلی مناکر بھی برسوں زندہ رہتے ہیں اور ایک جونک کی طرح رعایا کا خُون چوستے ہیں اور آہستہ آہستہ برسوں تک جیتے رہتے ہیں اور مرنے کا

نام تک نہیں لیتے۔ ایسے بادشاہوں کو ناسوری بادشاہ کہتے ہیں

مندرجہ بالا قسموں کے علاوہ اور جو بادشاہ نظر آئیں۔ وہ غیر ضروری بادشاہ ہیں۔ یوں تو بادشاہ عموماً غیر ضروری ہی ہوتے ہیں۔ لیکن خاص طور پر جو بادشاہ کہانیوں میں نظر آئیں۔ وہ بالکل ہی غیر ضروری ہوتے ہیں۔ اس لئے پیارے بچو آئندہ جب کبھی تم اپنی نانی اماں سے یا دادی اماں سے یہ کہانی سنو ــــ کہ ایک تھا بادشاہ! ــــ تو فوراً پوچھو ــ کون سا بادشاہ؟ کس قسم کا بادشاہ...؟

سوالات

(الف) تمہیں بادشاہوں کی کونسی قسم پسند ہے اور کیوں؟ اپنے لئے ایک پاگل خانہ بھی تجویز کرلو۔

(ب) اگر تمہیں ہندوستان کا بادشاہ بنا دیا جائے تو تم کیا کام نہ کرو گے؟ جواب سوچ کر لکھو اور اگر صحیح جواب نہ دے سکو تو فوراً خودکشی کرلو۔

(ج) اگر ایک بادشاہ اپنے آپ کو بیک وقت جمہوری، تیموری اور ضروری بادشاہ بنلائے تو ایسے بادشاہ کو غیر ضروری بادشاہ بننے میں کتنا وقت درکار ہوگا۔

جواب دیتے وقت جی حضوری مت بنو!

(د) اگر ایک تیموری بادشاہ ایک سال میں ایک ملک فتح کرتا ہے تو اسی عرصہ میں ایک انگوری بادشاہ کتنی شراب پی سکتا ہے؟ اربعہ لگا کر بتاؤ۔ اگر اربعہ

صحیح ہوا۔ تو تمہیں یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ ایک تیموری بادشاہ کو انگوری بادشاہ بننے میں کتنا وقت لگے گا؟

(۷) ختوری بادشاہ کی خوبیاں بیان کرو۔ اگر تمہیں کسی ختوری بادشاہ کا وزیر بنا دیا جائے تو تم اپنے آپ کو بچانے کے لئے کیا ترکیب استعمال کروگے۔ پرچہ ترکیب استعمال نہایت احتیاط سے جواب کے ساتھ نتھی کر دو۔ تاکہ آئندہ نسلوں کے کام بھی آسکے۔

ایک سویئلی تصویر

جس کی ابھی تک کوئی ابتدا ہے نہ انتہا!

اور جو ہر وقت میری آنکھوں کے آگے ناچتی رہتی ہے

اُس دن میں بہت اُداس تھا۔ کیونکہ اُس روز میں نے ایک کتاب میں جرمنوں کے اُن وحشیانہ مظالم کا حال پڑھا تھا۔ جو اُنہوں نے جنگ کے دوران میں یوکرین کے معصوم بچوں پر روا رکھے۔ یوں تو ہر آدمی موت کے سامنے معصوم ہوتا ہے اور زندگی کی آخری حد پر اُس کی حیثیت ایک ننھے بچے سے بڑھ کر نہیں ہوتی۔ میں نے بڑے بڑے مجرموں اور پھانسی پر لٹکنے والے قاتلوں کو موت کی تاریک سُرنگ کی دہلیز پر ایک معصوم بچے کی طرح مغموم اور پریشان

دیکھا ہے۔ مُنہ میں اُنگلی ڈالے ہوئے جیسے انہوں نے کبھی جرم نہ کیا ہو۔ جیسے اُن کی نگاہوں میں ابھی وُہ حیرت و استعجاب باقی ہو جس سے انہوں نے اپنی زندگی کے پہلے روز دنیا کو دیکھا تھا۔

لیکن بچّوں کا معاملہ اور ہے۔ اگر عادی مجرم موت کے سامنے اس قدر معصوم ہو سکتے ہیں تو اُس نو زائیدہ کلی کی لطافت کا کیا کہنا جو ابھی موت اور زیست میں امتیاز ہی نہیں کر سکتی۔ جس کی دُنیا ابھی گناہ و سزا اور قتل و خون کے تصوّر سے ملوّث ہی نہیں ہوئی۔ اس لطافت کو کچلنے کے لئے کسی غیر معمولی طاقت کی ضرورت ہے۔ ایسی طاقت جس میں انسانیت کی ایک رمق بھی باقی نہ ہو۔ ایسی قوت جو انسان کے سینے سے نہیں، کسی بھی ذی حس کے سینے سے نہیں۔ بلکہ ایک سنگلاخ چٹان کی چھاتی سے پھوٹ کر نکلتی ہے۔ یہ وحشی بربری قوت انسان کی دُنیا میں کیسے آگئی؟ اُس دن، اُس وقت کتاب اُلٹ کر میں یہی سوچ رہا تھا۔ سالہا سال، صدہا برس پیچھے، زمانے کے کُہنہ اور شکستہ زینے پر میرا ذہن دوڑتا گیا۔ ایک جنگ کے بعد دوسری جنگ کے مناظر دیکھتا گیا۔ یہ شقاوت نئی نہ تھی۔ کبھی اس کا نام جرمن تھا تو کبھی تاتاری، کبھی رُوسی تو کبھی انگریزی، کبھی امریکن کبھی ہندی، کبھی ایرانی۔ لیکن تھا یہ وُہی جذبہ۔ جو انسان کے سینے سے نہیں چٹان کی چھاتی چیر کر نکلا ہے۔ لیکن آدمیوں کی بستی میں اس کا کیا کام۔ قرن ہا قرن سے یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟ میں نے، تم نے اور اُس نے جسے سب لوگ

تاریخ کہتے ہیں۔ اسے اپنے ہاں کیوں جگہ دے رکھی ہے۔

یہی سوچ کر میں اُداس تھا۔ کتاب بند کر کے میں نے تپائی پر رکھدی۔ اور اپنی بچی کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ جو میری گود میں لیٹی ہوئی ایک چھوٹی سی کٹوری سے آلوؤں کا بھرتا نکال کر کھا رہی تھی۔ وہ مجھے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر مسکرائی۔ اُس کی ننھی ننھی اُنگلیوں سے بھرتا لگا ہوا تھا۔ اُس نے اپنا ہات میری طرف بڑھا کر کہا: "تاؤ"۔

میں نے کہا: "نہیں تم تاؤ"۔

"نہیں تم!" اُس نے اصرار کیا اور اپنی اُنگلیاں میرے مُنہ میں ڈال دیں اور میری زبان ٹٹولنے لگی۔ بولی: "تاؤ"۔

آلوؤں کا بھرتا کوئی بڑی چیز نہیں۔ بچی کا اپنے باپ سے پیار کرنا بھی ایک معمولی سی بات ہے۔ اتنی معمولی کہ اس سے کسی کہانی سُننے والے کو کوئی لطف نہیں آسکتا۔ مجھے بھی اُس وقت کوئی لطف حاصل نہیں ہو رہا تھا۔ اک بے کیف اُداسی طاری تھی۔ اب بھی یاد کرتا ہوں تو وہی بدمزگی تازہ ہو جاتی ہے۔ آلوؤں کا بھرتا گویا کونین کی طرح تلخ تھا۔ کیونکہ یوکرین میں بچوں پر گولی چلائی گئی تھی۔ ہاتھوں سے اُن کی آنکھیں نکال لی گئی تھیں۔ اُن کی لاشوں کو ننگا کر کے برف پر پھینک دیا گیا تھا اور یہاں میری بچی مجھے نہایت اطمینان سے کہہ رہی تھی: "تاؤ"۔ مگر اُس میں کیا اُس کا قصور تھا؟ آلو کے بھرتے کا؟ کانسی کی کٹوری کا؟ یا ننھی کی

محبت بھری نگاہوں کا ؟

جس جرمن نے گولی چلائی تھی۔ جس آدمی نے پہلی بار گولی چلائی تھی۔ جو آج بھی سنگین سے اپنے بچوں کو تہ تیغ کر رہا تھا۔ اُسے اسی محبت بھری نگاہ نے، اسی آلو کے بھرتے نے۔ اسی کانسی کی کٹوری نے جنم دیا تھا۔ پھر وُہ محبت وُہ معصومیت کیونکر فنا ہو گئی ... کیونکر ... کیونکر ... میرے خدا ؟

میں نے بچی کو صوفے پر لٹا دیا اور گھر سے باہر نکل کھڑا ہوا۔ ابھی دروازے پر تھا کہ بچی نے پکارا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وُہ اپنے دونوں ہات بڑھائے، ایک میں کانسی کی کٹوری، دوسرے میں آلو کا بھرتا لئے کہہ رہی تھی: "تاؤ"۔

"بے وقوف کچھ سمجھتی نہیں، خود جنم لے کر جنم دیتی ہے۔ آدمی کی ماں بن کر چٹان کی تخلیق کرتی ہے۔ اب کوئی تجھ سے کیا کہے۔ "تاؤ"! آج آلو کا بھرتا کھلا رہی ہے۔ کل کو گولی چلوائے گی۔ نہیں میں نہیں کچھ کھاتا وا تا"۔

میں جب اُداس ہوتا ہوں تو ہمیشہ "غریب گھر" کا رُخ کرتا ہوں اور شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہو کہ میں اس غریب گھر کے سامنے سے نہ گزروں۔ نجانے لوگ اُسے غریب گھر کیوں کہتے ہیں۔ پھول گیٹ کے باہر پتھر پل کے اُس پار یہ غریب گھر واقع ہے۔ اُس کے سامنے مٹیالی دُکانیں ہیں۔ جن میں جوتے بنانے والے چمار، سائیکل، گراموفون، سنگر مشین درست کرنے والے لوہار، عرضیاں، مثلیں

اور دستاویزیں ٹائپ کرنے والے فن کار کام کرتے ہیں۔ نکڑ پر پتھر پُل کے قریب ایک ایرانی کا ہوٹل ہے۔ جہاں چائے کے گندے پیالوں میں غیر جمع شدہ چمچے کھڑکھڑاتے ہیں اور بھورے رنگ کے سیال سے پُرانے گڑ کی مہک آتی ہے۔ ہوٹل کے باہر ہمیشہ گوشت کے جلنے کی بُو آتی ہے۔ یہاں لوگ باگ کھڑے ہو کر کباب کھاتے ہیں اور کباب کھا کر سگریٹ اور پان سے لطف اُٹھاتے ہیں۔ دو چار پنشن یافتہ بیرے پُل پر بیٹھے رہتے ہیں اور اپنے انگریز مالکوں کی محیر العقول داستانوں کو ماضی کے کھنڈروں سے کھود کھود کر بیان کرتے رہتے ہیں۔ دو کوڑھی، ایک مرد، ایک عورت، ہمیشہ قریب قریب بیٹھتے ہیں۔ آپس میں ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے ہوئے رہگیروں کی طرف اس انداز سے دیکھتے ہیں۔ گویا وُہ اُن کی تنہائی میں مخل ہوتے ہوں۔ کبھی کبھی عورت کوڑھی کے سر پر سے جوئیں چُننے میں مصروف ہوتی ہے۔ پُل کی محراب کے نیچے دھوبی کپڑوں کو پتھروں پر کوٹتے نظر آتے ہیں اور چھُوا چھو کرتے ہوئے اپنی کمر کو کھجانے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی وُہ اپنا ہات روک کر نالے کے قریب نیم کے پیڑ سے لگے ہوئے جھُولے کی طرف دیکھتے ہیں۔ جہاں اُن کی لڑکیاں اور بہوئیں جھولا جھول رہی ہوتی ہیں اور ننھے بچے گوپھیا لئے عقبی دیواروں پر چڑیوں کو نشانہ بنانے کی فکر میں غلطاں نظر آتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے دروازوں والے گھروں کے پنجروں میں سے زرد رو عورتیں جھانکتی ہیں۔ بوڑھی عورتیں جنہوں نے ایک عجیب سا

گونا پہن رکھا ہوتا ہے اور لمبی ناک والے پارسی لڑکے اپنے پچکے ہوئے گالوں میں کریہہ دانت چھپائے رنگدار بیلون اڑاتے نظر آتے ہیں۔ پارسی لوگوں کے گھروں کے باہر دہلیز پر اور دہلیز سے باہر فرش پر کھڑیا مٹی یا چاک سے پھول پتیاں بنی ہوتی ہیں۔ یہ ہر پارسی گھر کا امتیازی نشان ہیں۔ اُس سبز رنگ کے گھر کے پاس جس کی دیواریں چھوٹی ہیں اور جس کی جھکی ہوئی بھوری چھت پر سے بجلی کے کھمبے کے تار گزرتے ہیں۔ مجھے ہر شام کو جب میں اس طرف کا رُخ کرتا ہوں۔ وُہ لڑکی دکھائی دیتی ہے۔ سپید ریشمیں ساری میں ملبوس، سپید سینڈل پہنے وہ پارسی لڑکی کھڑی ہوتی ہے۔ جس کی تبسّم کناں آنکھیں مجھے اس قدر پسند ہیں۔ وُہ یہاں اکثر کھڑی ہوتی ہے۔ اُس وقت جب میں یہاں سے گزرتا ہوں۔ یہ بھی اپنا بہترین لباس پہنے اپنے امریکن محبوب کی آمد کی منتظر ہوتی ہے۔ میں اس طرح آتا ہوں۔ گویا میں ہی اس کا محبوب ہوں۔ یہ میری طرف اس طرح دیکھتی ہے۔ جیسے عمر بھر اس امر کا کوئی امکان نہیں۔ کیوں نہیں؟ میں اسے پسند کرتا ہوں۔ یہ مجھے کیوں پسند نہیں کرتی۔ کیوں نہیں؟ میں اور امریکن سپاہی دونوں اس کے محبوب کیوں نہیں ہو جاتے؟ یا امّی ابا کی طرح یہ لڑکی بھی ایک سے دو کیوں نہیں ہو جاتی؟ فی الفور؟ اور کیوں جب یہ ایک سے دو ہوتی ہے تو کوکھ کی اہرامی تاریکی میں نو مہینے تک ایک بیج کی پرورش کرتی ہے اور جب اپنا بدل پیش کرتی ہے تو خود ریشم کے پتنگے کی طرح مرجھا جاتی

ہوتی ہے اور راہگیر مسافر اُسے للچائی ہُوئی نظروں سے دیکھنے والا تماشائی گزر چکا ہوتا ہے۔

اس پتھر کے پل کے پار غریب گھر ہے۔ غریب گھر میں دو رویہ بارکیں بنی ہُوئی ہیں۔ ان بارکوں کا رنگ سیاہ ہے۔ ان بارکوں کو ایک پارسی لکھ پتی سوہن جی گوڈن والا نے تعمیر کرایا تھا۔ غریب گھر! کیا لکھ پتی ہمیشہ غریب گھر ہی تعمیر کرا سکتے ہیں۔ کیا بنکر صرف جنگ کرا سکتے ہیں۔ کیا ایسی دولت سچ مچ زندگی چُوس لیتی ہے اور سیاہ رنگ کی بارکیں تعمیر کرتی ہے۔ اس غریب گھر کے دروازے پر لوہے کا کٹہرہ ہے اور لوہے کے کٹہرے کے باہر بازار ہے اور مٹیالے رنگ کی دکانیں ہیں اور تنگ دروازوں والے نیچی چھتوں والے گھر ہیں۔ جن میں سے زرد رو عورتیں جھانکتی رہتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس لوہے کے کٹہرے کے دونوں طرف غریب گھر ہے۔ ایک غریب گھر تو سوہن جی گوڈن والے نے تعمیر کیا ہے۔ لیکن یہ دوسرا غریب گھر جو اس غریب گھر کے باہر ہے۔ کس نے بنایا ہے؟ بس کہانی سننے آتے ہو، جواب نہیں دے سکتے! گونگے ہو؟ بہرے ہو؟ اندھے ہو؟ اُس غریب گھر کو دیکھتے ہو، اس غریب گھر کو نہیں دیکھتے جو تمہارے اردگرد، ہر جگہ، حتیٰ کہ تمہارے اندر بھی موجود ہے، میں پگلا ہوں؟ ہا ہا۔ میرے اللہ اس سے بہتر مذاق تجھے کبھی نہ سوجھا ہوگا۔

لیکن، نہیں، میں اب کچھ نہ کہوں گا اور سیدھا اُس لوہے کے کٹہرے کے پاس پہنچ جاؤں گا جو غریب گھر کے باہر ہے اور بازار کی سڑک کو اُس سے جُدا کرتا ہے۔ میں اُسی وقت یہاں آتا ہوں۔ جب میں بہت اداس ہوتا ہوں۔ یہاں غم غلط کرنے کے لئے ایک دوست، غمگسار ہستی موجود ہے۔ یہ ہستی غریب گھر کے اندر نہیں، غریب گھر کے باہر رہتی ہے۔ یعنی اُس لوہے کے کٹہرے اور بازار کی سڑک کے درمیان زمین کے اُس ٹکڑے پر جو دونوں غریب گھروں کو ایک دوسرے سے جُدا کرتا ہے۔

یہ ہستی یہاں کیوں رہتی تھی۔ اس لئے کہ وہ اس قدر نادار تھی کہ غریب گھر کی بارکیں بھی اسے پناہ دینے سے عاجز تھیں۔ اُس کی ٹانگیں نہ تھیں۔ صرف دو بازو اور ایک سوکھا ہوا جسم۔ جس پر سُوکھے سُوکھے پستان مردہ چوہوں کی طرح لٹکے ہوئے تھے۔ چہرے پر ان گنت جھریاں، دانت غائب اور سر کے بال سفید، اُلجھے ہوئے، مٹیالے، پریشان، ان بالوں میں کنگھی نہ ہوتی تھی۔ کبھی ہوتی ہو گی۔ اُس ہستی کا چہرہ عورت کا تھا۔ سر آئین سٹائین کا سا۔ یعنی اگر آئین سٹائین اپنے سفید بالوں میں کبھی کنگھی نہ کرتا تو ـــــ اور اگر وہ کسی غریب گھر کے آہنی کٹہرے کے باہر آکر رینگتا تو ـــــ تو وہ آئین سٹائین نہ ہوتا۔ زردی مائل، سپید رنگ کے اُلجھے بالوں والی بے دھڑ کی بڑھیا ہوتا۔ ہے نا ٹھیک۔

یہ جسم استخواں میرا دوست تھا۔ وہ عورت جس کا دھڑ نہ تھا۔ وہ سر جو آئین سٹائین

کا تھا۔ وہ آنکھیں جو گویا کسی کی نہ تھیں۔ کم از کم میں نے ایسی آنکھیں تو کسی انسان کے چہرے پر نہیں دیکھی۔ یہ مت پوچھو۔ کیا تھا اُن آنکھوں میں۔ یہ پوچھو۔ کیا نہ تھا اُن آنکھوں میں۔ کائنات کی ساری خوبصورتی اور ساری سوہناکی اُن آنکھوں میں سمٹ کر اُتر آتی تھی۔ نہ جانے کیسے؟ وہ ہمراز، غمگسار آنکھیں، سب کچھ سمجھ کر معصوم رہنے والی آنکھیں جیسے انہوں نے موت اور زیست کا بھرتا بنایا تھا اور اب مجھ سے توتلے انداز میں کہہ رہی تھیں "تاؤ!" —— غریب گھر کے باہر تہ بلیز پر سونے والی رُوح بھی اس قدر معصوم کیسے ہو سکتی ہے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ شاید اسی لئے دونوں دنیاؤں نے اُسے دھتکار دیا تھا کہ وہ اُسے سمجھ نہ سکی تھیں۔ اُس آہنی کٹہرے کے دونوں طرف جو دنیائیں تھیں۔ وہ ان میں سے کسی کی مخلوق نہ معلوم ہوتی تھی۔ بلکہ وہ ان دونوں کے بیچ میں آہنی کٹہرے سے لگی۔ سمٹی سمٹائی، دو گز زمین پر گھستی ہوئی، اپنے پُرشکن چہرے کو لئے۔ اپنی ان گنت جھریوں کو سہلاتی ہوئی الگ بیٹھی تھی اور دونوں دنیاؤں کا تماشہ دیکھتی تھی۔ میں نے اُسے کبھی بھیک مانگتے نہیں دیکھا۔ کئی بار میں اُس کے سامنے سے گزرا۔ پُرمعنی انداز میں اُسے گھورتا ہوا گزر جاتا تھا۔ لیکن اُس نے کبھی ہاتھ نہیں پھیلائے۔ دونوں دُنیاؤں کی دھتکاری ہوئی کتیا اس قدر مغرور کیوں تھی۔ کیوں؟ کیوں؟ میرے خدا!

ایک روز میں نے اُسے ایک آنہ دیا۔ اُس نے اُسے اُسی طرح کشکول میں

پڑے رہنے دیا اور پھر نگاہیں پھیر کر حلوائی کے لونڈے کو آواز دینے لگی: "ابے گڈو۔ بٹی کے لئے گلاب جامن لے آئیو"۔

دوسرے روز میں نے اُسے پھر ایک آنہ دیا

"ابے گڈو۔ لعل کے لئے امرتی لے آئیو"۔

تیسرے روز میں نے اُسے پھر ایک آنہ دیا

"ابے گڈو۔ شیریں کے لئے لڈو لے آئیو"۔

چوتھے روز میں نے اُسے پھر ایک آنہ دیا

"ابے گڈو۔ ہولی کے لئے تھوڑی سی ملائی لے آئیو"۔

اُس کے چار بچے تھے۔ بٹی، لعل، شیریں، ہولی، آدمی کے نہیں۔ بلی کے اور بلی کا نام گُل تھا اور وہ ایک سیاہ و سپید رنگ کا پھول تھی۔ جس کی ہتھیلیوں میں کانٹے چھپے ہوئے تھے۔ ملائم سمور کے اندر، گل بڑھیا کے کشکول کے سامنے پڑی رہتی۔ ایک نواب زادی کی طرح سست، کاہل اور منحوس۔ اور اُس کے بچے بڑھیا کے چاروں طرف کھیلتے، وہ اُس کے سوکھے پستانوں پر سے اُچھلتے ہوئے اُس کی ناک پر کود جاتے اور وہاں سے جست لگا کر اُس کے سپید گھنے بالوں کے جنگل میں اُچھلنے لگتے۔ اُن میں بٹی خاص طور پر بڑی شریر تھی اور بڑھیا کی پیاری تھی۔ میں نے بٹی کو اکثر بڑھیا کے سر پر بیٹھے دیکھا تھا۔ بٹی کو گلاب جامن بہت بھلتے تھے۔

"اور تم کیا کھاتی ہو" جب ہم دوست بن گئے۔ تو میں نے اُس سے پوچھنے کی جرأت کی۔

وہ ہات سے اشارہ کرتے ہوئے بولی: "میں اِدھر کا — اور اُدھر کا — دونوں طرف کا کوڑا کرکٹ کھاتی ہوں"

"تم غریب گھر کے اندر کیوں نہیں رہتی؟"

"وہاں تو عیسائی لوگ رہتے ہیں اور غریب پارسی"

"تم کون ہو؟"

"میں — میں پُوجا ہوں"

"پُوجا؟"

"ہاں پُوجا! ایک دن میری ماں مجھے اس غریب گھر کے دروازے پر چھوڑ گئی تھی۔ اُس دن شہر میں گنپتی پوجا کا تیوہار منایا جا رہا تھا۔ یہاں ایک کوڑھی بیٹھا تھا اُس نے مجھے پالا پوسا۔ میری ماں نے گنپتی پُوجا کی تھی نا۔ جبھی تو اُس نے ایسی سندر ناری کو جنم دیا تھا۔ ہا ہا ہا!"

"کون تھی تمہاری ماں!"

"یہ اپنی ماں سے پوچھو کہ ماں کون ہوتی ہے! میری ماں کو کس نے دیکھا ہے"

اور یہ ہے بھی سچ۔ پُوجا کی ماں کو کس نے دیکھا ہے۔ وہ تاریکی کی چادر اوڑھے

پربھات کی پہلی چھاؤں میں جب آکاش پر تاروں کے پاؤں بھی ڈگمگا رہے تھے یہاں ہولے ہولے قدموں سے آئی تھی۔ اُس وقت کوڑھی بھی سو رہا تھا اور لوہے کا کٹہرہ بھی بند تھا۔ اُس وقت وہ دیوی آئی تھی جس کا دل لوہے کا تھا اور اُس نے اپنی بیٹی کو لوہے کے کٹہرے کے حوالے کر دیا اور خود اُس پربھات کی چھاؤں میں گم ہو گئی۔ کیونکہ گنپتی نے اُسے جو بیٹی دی تھی۔ اُس کا دھڑ نہیں تھا اور اُس کے بال جنم سے سفید تھے۔

"پتہ نہیں۔ گنپتی مہاراج یہاں سونڈ لگانا کیسے بھول گئے"۔ یہ کہہ کر اپنی چھوٹی سی ناک تھپتھپانے لگی پھر مسکرا کر بولی "کہتے ہیں۔ گنپتی پوجن کے روز میں کوڑھی کی کٹیا کے آغوش میں لیٹی اُس کا دودھ پی کر سو گئی تھی اور جب کوڑھی اُٹھا تو اُس وقت بھی میں یہیں سو رہی تھی اور مندروں میں گنپتی پوجن ہو رہا تھا۔ کوڑھی نے مجھے اپنی گود میں اُٹھا لیا اور۔۔۔ پوجا!۔۔۔ سمجھے؟"

اُس کی آنکھیں جیسے ہنس رہی ہوں۔ میں اُس روز چپکے سے چلا گیا۔ اُس کے بوڑھے چہرے پر وہ آنکھیں ابھی تک جوان تھیں۔ وہ آنکھیں جو میری محبوب کی آنکھوں کی طرح تبسم کناں تھیں۔ نہیں۔ نہیں۔ یہ میری محبوب نہیں ہو سکتی۔ وہ تو پتھر کے پُل کے اُس پار ہے۔ امیبا کے دو ٹکڑے ہو سکتے ہیں۔ دو شخصیتیں بن سکتی ہیں۔ لیکن یہاں تو پتھر کا پُل بیچ میں حائل ہے۔ نہیں، نہیں یہ نہیں ہو سکتا پر یہ آنکھیں اس قدر جواں کیوں ہیں۔ اس قدر فہمیدہ، اس طرح ہر وقت مسکرانے

والی آنکھیں ۔۔۔ !

لیکن اُس روز کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔ وُہ جو کوڑا کرکٹ کھا کر مغرور تھی۔ وُہ جسے آج تک کسی نے بھیک مانگتے نہ دیکھا تھا۔ وُہ جس کا نام پوچا تھا اور جو ایک کوڑھی کی پروردہ تھی۔ اب میری دوست اور ہمراز تھی۔ وُہ سدا خوش رہتی تھی اور جب کبھی میں بہت اُداس ہوتا تو ہمیشہ اُس کے پاس آیا کرتا!

ایک دن میں نے اُس سے پُوچھا "تم اس قدر خوش کیوں ہو؟"

"کیوں کا کیا مطلب؟"

"یہی کہ بس تمہیں کبھی اُداس نہیں دیکھا"

اس کی آنکھوں کی پتلیاں ناچنے لگیں۔ سر کے بال اور بھی اِدھر کی جانب کھڑے ہوتے گئے۔ جیسے ان کی جڑوں میں برقی بٹن لگے ہوں۔ وُہ بولی "کوڑھی بابا ہمیشہ روتا رہتا تھا اور اُس کی ٹانگ پر ناسور تھا۔ میں ہمیشہ ہنستی ہوں۔ کیونکہ میرے دھڑ ہی نہیں ہے۔ ہا ہا ہا! گلاب جامن کھاؤ بِتّی، دیکھو دھڑ نہ ہونے پر بھی میرے بچے کس قدر پیارے ہیں۔ اِدھر آؤ۔ لعل، شیریں، بھولی، بِتّی۔ بِٹی۔ بِٹی۔ بیٹا۔ اپنے ہاتھوں سے اُنہیں اُچھالنے لگی۔ کشکول میں تھوڑا سا دودھ پڑا تھا اور زمین پر ڈبل روٹی کے چند باسی ٹکڑے۔ وُہ انہیں دودھ میں ڈال کر گھولنے لگی

مغرب!" میں نے کہا "مزے ہیں تمہارے اس جنگ کے زمانے میں بھی

ہمیں تو دودھ بھی نہیں ملتا۔"

وُہ بولی "یہ دودھ میرے لئے نہیں ہے۔ گُل کے لئے ہے۔"

میں نے گل کی طرف دیکھا۔ وُہ آج خلافِ معمول کشکول سے دُور ایک لال رنگ کے کپڑے میں سمٹی ہوئی، اک تکلیف دہ لہجے میں خرخر کر رہی تھی۔

"گُل کو کیا ہوا ہے؟" میں نے پُوچھا

وُہ مسکرا کر کہنے لگی "جھول دے گی دو ایک دن میں۔"

میں نے دو آنے کشکول کے پاس رکھ دیئے۔ وُہ کہنے لگی "نہیں تم سے ایک آنہ ہی لیتی ہوں۔ یہ لے جاؤ۔ پر کل ضرور آنا۔ کل گنپتی پوجن ہے۔ میرا جنم دن ہے۔ مٹھائی کھلاؤں گی۔ اُجلے کپڑے پہن کر آنا اور حجامت بنوا کر آنا! ہا ہا ہا۔"

بچی، بھرتے اور تاؤ، کو چھوڑ کر جب میں نے غریب گھر کا رُخ کیا۔ تو راستے میں ڈھول تاشوں اور بیل گاڑیوں کا اک غول بیابانی ملا۔ عورتیں زیوروں سے لدی پھندی تھیں۔ بیل گاڑیاں جھلکاریوں سے سجی ہُوئی تھیں اور بیلوں کے سینگوں پر سنگوٹیاں چڑھی ہُوئی تھیں اور اُن کے جسموں کو نسوانی ہاتھوں نے رنگا رنگ نقش و نگار سے سجایا تھا۔ آج گنپتی پوجن تھا اور اس لئے آج عورتوں کی آنکھوں میں کاجل گہرا تھا۔ ہونٹوں پر گیت تھے اور سینوں میں اک نامعلوم سی تھرتھری، جیسے کسی انجانے۔ اَن دیکھے۔ ان بُوجھے محبوب سے گلے ملنے کی تمنا اُن کے

سینوں کو ٹٹول رہی ہو۔ ڈھول کے شور میں گنپتی پوجن کا گیت گم ہو رہا تھا۔ پھول گیٹ پر بندھن واریں ۔ ۔ ۔ اور پُل کے اس پار تیری تبسم کناں، شبنم فشاں آنکھیں جانتا ہوں مجھے میرا انتظار نہیں ہے۔ جانتا ہوں کہ تیرے سینے کے عنبر کو میری نگاہوں کے شعلے نہیں چھو سکے۔ جانتا ہوں کہ تیری گردن کے خم کی ملائم برفیلی لذت سے میری انگلیوں کا لمس ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناآشنا رہے گا اور میں نہتا، بھوکا پیاسا، اس پتھر کے پُل پر سے گزر جاؤں گا۔ ایک گداگر جو دوسرے گداگر سے ملنے جا رہا ہے!

پتھر کے پُل کے اُس پار وہ بیٹھی ہے۔ ہنس رہی ہے۔ بلی کے بچّوں کو کھلا رہی ہے۔ آج گنپتی پوجن ہے اور اُس نے ہر بچے کے گلے میں لال، نیلے، پیلے اودے رنگوں کے چیتھڑے باندھے ہیں۔ آج بھی بلی اُس کے سر پر بیٹھی ہے اور بلی کی گردن میں ایک خوشرنگ بُو لگی ہے۔

میں نے اُس خوشرنگ بُو کی طرف اشارہ کرکے کہا: "تم نے یہ فیتہ کہاں سے لیا؟"

وہ بولی: "اُس لڑکی سے لیا ہے، جس کی طرف تم ہر روز گھور کر دیکھتے ہو۔"

"جھوٹ!" میں نے کہا

"نہیں سچ کہتی ہوں۔ اُسی سے مانگ کر حاصل کیا ہے۔ عمر میں آج پہلی بار بھیک مانگی ہے۔"

"کیوں؟"

وہ بولی: "آج گنپتی پوجن ہے اور مجھے اُس کی آنکھوں میں ——" وہ چُپ ہو گئی۔ لبوں پر اک پُراسرار تبسم تھا

"کہو! کہو!"

وہ ایک عرصے کے بعد بولی: "کچھ نہیں . . . جانتے ہو، آج تمہیں مٹھائی نہیں کھلاؤں گی۔ گو وعدہ تھا"

"ہاں۔ پر کیوں نہیں!"

"گل مر گئی ہے" اُس نے آہستہ سے کہا: "اور بچوں کو بہت بھوک لگی ہوئی ہے"

میں نے دیکھا۔ گل ایک کونے میں لال رنگ کے کفن میں مستور غریب گھر کی دیوار سے لگی پڑی ہے؛

"اور اس کے پیٹ کے اندر جو بچے تھے؟" میں نے پوچھا اور بٹی سے پیار کرنے لگا۔

"بس کوکھ اندھی ہو گئی۔ اب کیا ہو سکتا ہے"

بٹی بڑھیا کے سر سے اُچھل کر سڑک کی طرف بھاگی۔ ادھر سے ایک موٹر آ رہی تھی۔ تیزی سے

"ارے . . ."

آن واحد میں میں نے اُسے سڑک کے بیچوں بیچ گھسٹتے ہوئے دیکھا۔ بس ایک لمحے کی بات تھی اور پھر موٹر کا پہیہ اُس کے سر پر سے گزر گیا۔ چیخ کی سی آواز آئی۔ پھر بریکوں کا شور۔ بھاگم بھاگ۔ لوگوں کا جمع۔ ہجوم کے مختلف سُر . . . پہلے چند لمحے تو میں زمین میں گڑا رہا۔ پھر تیزی سے بھاگا اور ہجوم کو چیر کر اُس تک جا پہنچا۔ اور اُسے پہیئے کے نیچے سے کھینچ کر نکالنے لگا۔ لیکن جب تک اُسے باہر نکالا جائے وہ مر چکی تھی اور اُس کی گردن اور اُس کے بازو اندر کی طرف مڑے ہوئے تھے۔ آئین سٹائین کا سا سر پچک گیا تھا اور بھیجا سپید الجھے بالوں کے باہر اُبل رہا تھا۔

میں نے اُس کی گردن کو سیدھا کرنے کی کوشش کی اور اُس کے بازو الگ کئے تو دیکھا کہ اُس نے اپنے بازوؤں اور سینے کے ہالے میں بلّی کو چھپا رکھا ہے۔ بلّی اُس کے مُردہ سینے سے لگی تھی۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ بیچاری ڈر گئی ہو گی۔ جب میں نے اسے آہستہ سے چھوا۔ تو وہ اکدم اچھل کر ایک طرف ہو گئی اور بولی: "میاؤں" اب بلّی حیرت سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ پھر وہ بڑھیا کا سر سونگھنے لگی اور اس کے سر کے گرد طواف کرنے لگی اور بے چینی سے کہنے لگی: "میاؤں . . . میاؤں"

کار میں ریڈیو ابھی تک بند نہ ہوا تھا: "یوکرین کی فوجوں نے اپنے دشمن کو اپنے علاقے سے باہر نکال دیا۔ اب یوکرین آزاد ہے۔ دشمن کے چنگل سے آزاد ہے۔"

ایک سوریئلی تصویر

بٹن گھما کر کار کے مالک نے ریڈیو بند کر دیا۔

لوگ سوال کر رہے تھے۔ یہ سڑک کے بیچ میں کیسے آ گئی؟ لوگ پوچھ رہے تھے۔ اس بے دھڑ عورت کے پاؤں کہاں سے آ گئے تھے۔ کس طرح وُہ ایک بلی کے بچے کو بچانے کی خاطر عین سڑک کے درمیان آن پہنچی تھی۔ وُہ جو دن بھر میں ایک گز بھی نہ چل سکتی تھی۔ کس طرح چند لمحوں میں اس فاصلے کو طے کر کے موٹر کے پہیوں میں آ گھسی تھی۔

عجب سوریئلی منظر تھا وُہ، وُہ سپید مٹیالے سے بال، پُر شکن چہرہ، بے دھڑ جسم، سوکھے پستان اور بلی کی گردن میں رنگین فیتہ، اور بھیجا بالوں سے باہر، ایسی تصویر تو غالباً پی کاسو نے بھی نہ بنائی ہو گی۔ ڈالی کے ذہن میں بھی ایسا محیر العقول مرقع کبھی نہ آیا ہو گا۔ میں مسکرانے لگا۔ کیونکہ یہ رونے کا مقام نہ تھا۔

لوگ پوچھ رہے تھے۔ یہ کیسے ہوا۔ یہ کیسے ہوا؟ یقیناً یہ ایک معجزہ تھا۔ ایک معجزہ!

یقیناً یہ ایک معجزہ ہے۔ کوئی میرے دل کے اندر بار بار کہہ رہا تھا۔ ایک معجزہ۔ لیکن معجزہ یہ نہیں ہے کہ پوجا نے بلی کے بچے کو اپنی جان دے کر بچایا ہے معجزہ شاید یہ ہے کہ اُس نے تمہاری بچی کو بچایا ہے۔ اس ڈاڑھی والے بزرگ کی بچی کو بچایا ہے۔ اُس ادھیڑ عمر کے درزی کی بچی کو بچایا ہے۔ پوجا نے اُن تمام بچوں کو بچانے کی سعی کی ہے۔ جس کی معصومیت شب و روز اُن سے چھن رہی ہے

جن کی آنکھیں شب و روز ظالم ہاتھوں سے نکالی جاتی ہیں۔ جن کے سینے میں شب و روز دشمن کی گولیاں پیوست ہوتی جاتی ہیں۔

"میاؤں۔ میاؤں"

لوگ کہہ رہے تھے۔ کمبخت نے ایک بلی کے بچے کو بچانے کے لئے اپنی جان دے دی!

کمبخت گداگر عورت ۔۔۔!

میرا جی چاہتا تھا کہ میں اُس وقت اُن لوگوں سے کچھ کہوں۔ میں کیا کہنا چاہتا تھا۔ میں بتاؤں۔ میں کیا کہنا چاہتا تھا اُن سے۔ میں اُن سے یہ کہنا چاہتا تھا۔ کہ ہاں یہ وہی گداگر عورت ہے۔ جسے دنیا نے کچھ نہ دیا تھا۔ جسے اس کی ماں نے اپنی تخلیق پر شرمندہ ہو کر آہنی کٹہرے کے حوالے کر دیا تھا۔ جسے ایک کوڑھی نے پالا تھا۔ وہ جس کی ٹانگیں نہ تھیں جس کا دھڑ بے کار تھا۔ جس کی کوکھ اندھی تھی۔ وہ آج مر گئی۔ ایک بچے کے لئے۔ ایک حسین خیال کے لئے، ایک سُہانی اُمید کے لئے اگر یہ موت ہے؟ تو صلیب کسے کہتے ہیں۔ زندگی کسے کہتے ہیں۔ حیاتِ جاوداں کسے کہتے ہیں۔ کیا تم اس عورت کے چہرے کی مسکراہٹ نہیں دیکھ سکے۔ اس کی آنکھوں کا روشن تبسّم نہیں پہچان سکے۔ جو ہر وقت، ہر لمحے، ہر صدی، تاریخ کے ہر صفحے پر انسان کی محبت کے راگ گاتا ہے اور معصومیت کے اُس سرچشمے کو بچانے کی کوشش کرتا ہے جو انسان کے سینے میں شب و روز سوکھتا جاتا ہے ۔۔۔

"میاؤں! میاؤں!"

یکایک میرے دل پر ایک عجیب کپکپی سی طاری ہو گئی۔ مجھے محسوس ہوا۔ جیسے میں بھوکا تھا۔ ننگا تھا۔ نہتا تھا۔ بے یار و مددگار تھا۔ جیسے یہ سب لوگ میری طرح بھوکے، ننگے، پیاسے تھے اور اس گداگر عورت نے ہمیں کپڑے پہنائے تھے ہمارے بالوں میں کنگھی کی تھی اور اُن میں لال پیلے رنگ کے فیتے سجائے تھے۔ اور پھر اپنے سر پر بٹھایا تھا اور میں اپنے آپ سے اور اُن تمام لوگوں سے جو اک ہجوم کی صورت میں اُس بڑھیا کے گرد جمع تھے۔ کہنا چاہتا تھا۔ اسے دیکھتے نہیں اسے دیکھتے نہیں ہو۔ آج محبت نے موت پر فتح پائی ہے۔ آج ظلم کا جال ٹوٹ رہا ہے۔ آج آزادی کا راگ بج رہا ہے۔ آج یوکرین میں دُشمن پیچھے ہٹ رہا ہے اور معصوم بچے آگے بڑھ رہے ہیں! بلّی کے بچے۔ آدمی کے بچے۔ ۔ ۔!

"میاؤں۔ میاؤں"

میں اُن سے یہ سب کچھ کہنا چاہتا تھا۔ یہ سب کچھ۔ لیکن میں اُس وقت کچھ نہ کہہ سکا۔ کیونکہ وُہ لوگ اجنبی تھے۔ وہ لوگ بڑھیا کو جانتے تھے۔ وُہ اسے احمق سمجھ رہے تھے۔ وہ لوگ ریس جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ وُہ لوگ تیوہار کی خوشیوں میں مگن تھے۔

اور کار کا مالک کہہ رہا تھا: "اس حرامزادی کو آج ہی مرنا تھا۔ اسی وقت۔ اب ریس میں جانے کے بجائے تھانے میں رپورٹ کے لئے جانا پڑ گیا!"

اور پولیس کا سپاہی بھنگی سے کہہ رہا تھا۔ ارے۔ اُس چیتھڑے کو اس کمبخت بڑھیا کے سر پر ڈال دو اور اسے سڑک کے کنارے رکھ دو۔ ابھی تھوڑی دیر میں بیل گاڑی آتی ہوگی"۔

"کول۔ کول۔ ڈیوک۔ ڈیوک۔ سپورٹنگ ٹائمز"۔ ۔ ۔ لڑکے چیخ چیخ کر ریس کے پمفلٹ فروخت کرتے ہوئے ادھر آ رہے تھے۔ لوگ جلدی جلدی جیب سے نقدی نکال کر انہیں خریدنے لگے۔ اب اُن کے ذہن میں گھوڑے، جاکی اور ٹوٹ کی تصویریں گھوم رہی تھیں۔

ایک بازاری کتا دُم ہلاتے ہوئے کار کے قریب آیا۔ پہلے اُس نے دائیں طرف کے پچھلے پہیئے کو سونگھا اور ٹانگ اٹھا کر پیشاب کر دیا۔ پھر وُہ دوسرے پہیئے کی طرف گیا۔ وہاں بھی اُس نے پیشاب کر دیا۔ پھر وُہ تیسرے پہیئے کی طرف گیا۔ وہاں بھی اُس نے ٹانگ اُٹھا کر پیشاب کیا۔ پھر وُہ چوتھے پہیئے کی طرف مڑا اور پیشاب کر کے دُم ہلاتا ہوا چلا گیا۔ لوگ بھی پمفلٹ خرید کر جا چکے تھے۔

پولیس والا کار کے مالک کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا اور کار چل دی۔

سڑک کے ایک کونے میں ایک لال، پیلے، نیلے اودے رنگوں والا چیتھڑا اُبھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا

"میاؤں۔ میاؤں"

مندروں میں گھنٹیاں بج رہی تھیں۔

"کول۔کول..."

"ڈیوک ڈیوک..."

"سپورٹنگ ٹائمز..."

یکایک مجھے معلوم ہوا کہ میں چٹانوں کے بیچ میں کھڑا ہوں۔دُنیا کی کوکھ اندھی ہو چکی ہے۔اور آج گنپتی پُوجن ہے....!

یہاں سب غلیظ ہیں

(ایک تمثیل)

افرادِ ڈرامہ

جگ موہن : نوجوان رئیس زادہ۔ جوشیلا۔ باتونی۔ بے عمل۔ ڈرپوک۔ نروس
خطیبانہ اندازِ گفتگو۔

رمبھا :۔ کم گو۔ جگ موہن کی بیوی۔ ہنسی اور لہجے میں طنز کی جھلک نمایاں ہے

ونود :۔ جگ موہن کا دوست

انور :۔ جگ موہن کا دوست۔ بھاری آواز

منشی جی : کارندہ۔ وکیل۔ نیم۔ خوشامدی۔ تملق پسند

...یہاں سب، غلیظ ہیں

پاسی :- نئے زمانے کا کسان
سیٹھ جی :- پرانے زمانے کا رئیس۔ بھاری تحکمانہ لہجہ
چھمیا :- سیٹھ جی کی داشتہ۔ نوجوان۔ شوخ۔

وقت :- سہ پہر
مقام :- جگ موہن کا ڈرائنگ روم۔ ایک دروازہ سیٹھ صاحب کے دیوان خانے میں کھلتا ہے۔ دوسرا رمبھا کے مطالعے کے کمرے میں۔ تیسرا دروازہ ملاقاتیوں کے لئے ہے۔ اس وقت تینوں دروازے کھلے ہیں۔
(جگ موہن۔ رمبھا۔ انور اور ونود چائے پی رہے ہیں)

جگ موہن :- ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا انور ؟
انور :- (چڑ کر) جگ موہن بھائی۔ میں کئی بار عرض کر چکا ہوں کہ مجھے تمہاری باتیں یاد نہیں رہتیں۔ پھر میں تمہاری ڈائری نہیں۔ یادداشت نہیں۔ روزنامچہ نہیں اور اس پر مصیبت یہ ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ جو جملہ تمہاری زبان سے ادا ہوتا ہے۔ وہ ارسطو کی آخری تفسیر ہے۔
رمبھا :- (ہنستی ہے)

جگ موہن :- رمبھا اس میں ہنسی کی بات ہے ۔
رمبھا :- کچھ نہیں (کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے)
جگ موہن :- پھر وہی۔ ٹھی ٹھی ہنس رہی ہو۔ آخر مجھے بھی کچھ پتہ چلے۔
رمبھا :- انور بھائی کو اُن کے والد مجبور کر رہے ہیں کہ وہ انجمن فلاح و بہبودیٔ خواتین ہند کا کام چھوڑ دیں اور اینٹوں کا بھٹہ سنبھال لیں۔ اس پر انور بھائی کو غصہ آ رہا ہے اور وہ غصہ اب آپ پر اتارا جا رہا ہے۔ کیوں انور بھائی؟
انور :- تمہیں چڑیل — زبیدہ نے بتایا ہوگا ؟
رمبھا :- (ہنستی ہے)
دلنود :- یہ بھی اچھی رہی (ہنستا ہے)
انور :- (ڈپٹ کر) تم چُپ رہو رنود
جگ موہن :- کیوں ؟ ونود کیوں چُپ رہے ؟ اس ٹریجیڈی کے متعلق تمہارے ہر دوست کو رائے دینے کا حق ہے! (وقفہ) لیکن مجھے اس میں ہنسی کی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ میں نہیں سمجھ سکتا۔ آخر تمہارے والد کو یہ حق کیسے حاصل ہے کہ وہ تمہیں اینٹوں کے بھٹے کے کاروبار میں لگا دیں۔ تم سوسائٹی کے ایک تعلیم یافتہ ترقی پسند مرد ہو۔ روشن خیال بلکہ آزاد خیال ہو (آواز بلند ہوتی جا رہی ہے) تم اپنی زندگی قوم اور ملت کے لئے وقف کر چکے ہو۔ اپنے وطن کی اُن لاکھوں کروڑوں معصوم و بے زبان عورتوں

کے لئے جو . . . .

رمبھا :۔ (بات کاٹ کر) انجمن فلاح و بہبودئ خواتینِ ہند ! (ہنستی ہے)

جگ موہن :۔ (غصّے سے) پھر؟ . . .

رمبھا :۔ معاف کرنا جگ ڈارلنگ۔ مجھے اینٹوں کا بھٹہ یاد آ رہا ہے (ہنستی ہے)

جگ موہن :۔ اینٹوں کا بھٹہ؟ ہاں ہاں، انور اینٹوں کا بھٹہ تمہاری ذہانت کو کچل کر رکھ دے گا۔ تمہاری فطری صلاحیتوں کو پامال کر دے گا۔ میں کہتا ہوں۔ دُنیا کے کسی باپ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وُہ اس طرح اپنے بیٹے کی روحانی تمنّاؤں کو کچل دے۔ یہ سماج کا ظلم ہے۔ بیداد ہے ! بیداد ہے بیداد ہے !!

ونود :۔ (شوخی سے) تمہیں اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا چاہئے۔ انو

انور :۔ (ڈپٹ کر) تم چُپ رہو ونود۔

جگ موہن :۔ ونود کیوں چُپ رہے؟ ونود بھی تمہارا دوست ہو۔ وُہ بھی ایک روشن خیال بلکہ آزاد خیال انسان ہے۔ وُہ بھی اک نئے سماج کی تعمیر چاہتا ہے۔ جہاں باپ بیٹے پر ظلم نہ کر سکے۔ جہاں وُہ اُس کی اُمیدوں کے ہرے بھرے نخلستان کو برباد نہ کر سکے۔ میں کہتا ہوں انو تم انکار کر دو فوراً انکار کر دو۔ کہدو میں اینٹوں کا بھٹہ نہیں چاہتا۔

رمبھا :۔ (ہنس کر) انجمن فلاح و بہبودئ خواتینِ ہند چاہتا ہوں۔

جگ موہن :- (غصّے سے) رمبھا!

رمبھا :- (بالکل ملائم) Sorry

جگ موہن :- انکار کردو انور۔ ورنہ تمہاری زندگی تباہ ہوجائے گی۔ نیا اخلاق اس ظلم کو چپ چاپ سہنے کی اجازت نہیں دیتا۔ زندگی ایک مقدس شے ہے اور جو والد اپنے بیٹے کی زندگی تباہ کرنا چاہتا ہے۔ دانستہ یا نادانستہ طور پر۔ شعوری یا لاشعوری طریق پر۔ وُہ خود بداخلاق ہے ایں تم سے کہتا ہوں انو۔ اگر میرا باپ مجھ سے اس قسم کی بداخلاقی برتے تو ——

(اس موقعہ پر چھمیا گنگناتی ہُوئی داخل ہوتی ہے)

چھمیا :- سانوریا! نجریا توری —— سانوریا۔ توری نجریا آآآ... اوہ چھوٹی سرکار ہیں۔ معاف کیجئے گا۔ میں سمجھی بڑی سرکار کا کمرہ.....

جگ موہن :- سیٹھ صاحب دیوان خانے میں ہیں۔ اسی دروازے سے تشریف لے جائیے۔

چھمیا :- شکریہ۔ شکریہ۔ (سارنگیے سے) چلے آؤ۔ ودلو۔ کوئی نہیں۔ اپنی ہی سرکار ہیں (گنگناتی ہُوئی جاتی ہے) سانوریا... توری نجریا نے.... سانوریا...

جگ موہن :- ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا ونود؟

ونود :- ذکر باپ کی بداخلاقی کا ہو رہا تھا کہ ——

رمبھا :۔ کچھیا جان آگئیں (ہنسی)

جگ موہن :۔ رمبھا۔ تم ہمیشہ یونہی موقع بے موقع ہنستی ہو۔

رمبھا :۔ معاف کردو۔ جگ ڈارلنگ۔ میں تم پر نہیں، پھپیا جان کے لباس پر ہنستی تھی۔ کیسا بھونڈا مذاق ہے اُس کا۔ شانے ننگے۔ سینہ ننگا۔ بلاوز پیچھے سے گہرا کٹا ہوا۔ عریانیت کی زندہ تصویر۔

جگ موہن :۔ عریانیت میں کیا بُرائی ہے؟ تمام جانوروں میں صرف ایک انسان ایسا ہے جو کپڑے پہنتا ہے (قہقہہ) یہ امر خلافِ فطرت ہے۔ عریانی عین فطرت کے مطابق ہے۔ میں تو زندگی کو اُس کے اصلی روپ میں دیکھنا پسند کرتا ہوں۔

ونود :۔ یعنی ننگا۔ بالکل عریاں۔

جگ موہن :۔ ہاں۔ عریاں۔ عریانیت میں زندگی کا صحیح اخلاق ہے۔ جب ہم اپنی زندگی میں اپنے قول وفعل، اپنے سماج، اپنی معاشیات، اپنے رسم ورواج کو بالکل ننگا دیکھ سکیں گے۔ اُس وقت دُنیا صحیح معنوں میں آزاد ہوگی۔ جب ظاہر وباطن میں فرق نہ ہوگا۔ جب کہنے اور کرنے میں فرق نہ ہوگا۔ جب انسان کی معاشی، معاشری اور تمدنی زندگی پر پڑے ہوئے سب آداب اور کپڑے اُتر جائیں گے۔ اُس وقت دُنیا آزاد ہوگی اور ترقی کی طرف گامزن ہوگی!

انور :۔ کیا ترقی ننگے سینے، ننگے شانے اور گہرے کٹے ہوئے بلاؤز سے تعلق رکھتی ہے؟

جگ موہن :۔ کیوں نہیں۔ میں تو چھمیا کو داد دیتا ہوں کہ وہ ہمیشہ کم سے کم کپڑا استعمال کرتی ہے۔ آخر انسان کے جسم کی ساخت سے کون آگاہ نہیں ہے؟ پھر اسے چھپانے سے کیا حاصل؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انسانی جسم کی ساخت سے کس طرح بد اخلاقی پھیلتی ہے؟ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ فطرت بد اخلاق ہے! ورنہ ننگے شانے دیکھ کر آپ کے دل میں بد اخلاقی نہ عود کر آتی!

ونود :۔ فطرت ہرگز بد اخلاق نہیں ہے

رمبھا :۔ فطرت بد اخلاق ہے ونود بھائی۔ ورنہ آپ حضرت گنج میں کپڑے کی دکان نہ کھولتے۔

ونود :۔ (بھناگئے) میں — میں — کپڑوں کی دکان کرتا ہوں — مگر — مگر — اس کا عریانیت سے کیا تعلق .... بد اخلاقی سے کیا واسطہ؟ .. ... وہ — وہ تو میرے والد کی دکان ہے!

انور :۔ (چڑ کر) تو ابٹوں کا جھٹہ بھی تو میرے باوا کا ہے!!

رمبھا :۔ (ہنس کر) اور چھمیا بھی تو جگ موہن کی نہیں۔ بڑے سیٹھ جی کی داشتہ ہے

(پس منظر میں چھمیا کے گانے کی آواز سنائی دیتی ہے)

جگ موہن: (گرج کر) رمبھا!

رمبھا:۔ (بالکل ملائم آواز میں) معاف کردو جگ ڈارلنگ . . . . مگر میں تو تمہارے حق میں کہہ رہی تھی (وقفہ) آہ! یہ غزل تم نے سُنی۔ چھمیا کبھی کبھی تو دل تڑپا دیتی ہے (سرگوشی سے) ذری یہ دروازہ تو کھول دو چُپکے سے

(اب چھمیا کے گانے کی آواز صاف سُنائی دیتی ہے)

چھمیا:۔ ؎

نہ شعور میں جوانی، نہ خیال میں روانی
کوئی سُن کے کیا کرے گا مری دُکھ بھری کہانی
تری زندگی حقیقت، مری زندگی فسانہ
وُہ خِرد کی تنگ ظرفی، یہ جنوں کی بیکرانی
رہے دل کا داغ دائم کہ جھلک رہی ہے اس میں
ترے مہر کی تمنّا، ترے قہر کی نشانی
مجھے اور زندگی دے کہ ہے داستاں ادھوری
مری موت سے نہ ہوگی مرے غم کی ترجمانی
(ندیم)

سیٹھ جی:۔ (دوسرے کمرے سے بلند آواز میں) دروازہ بند کردو جگ موہن دروازہ بند کردو۔

(جگ موہن آہستہ آہستہ دروازہ بند کرتا ہے۔ چھمیا کی آواز فیڈ آؤٹ ہوتی جاتی ہے)

انور:۔ (طنزاً) دروازہ بند کر دو۔

ونود:۔ (طنزاً) دروازہ بند کر دو کہ چھمیا گا رہی ہے

رمبھا:۔ (طنزاً) چھمیا جو عریانیت پسند ہے

انور:۔ (طنزاً) چھمیا جو طوائف ہے۔

جگ موہن:۔ (دروازہ بند کر کے) مجھے طوائفیت پسند نہیں مگر یہ سیٹھ جی کی پرائیویٹ زندگی ہے۔ میں اُنہیں کیسے سمجھاؤں؟ اور میں یہ حق بھی نہیں رکھتا کہ اُن کی پرائیویٹ زندگی میں دخل دوں۔ میں کسی انسان کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ دوسرے انسان کی پرائیویٹ زندگی میں دخل دے۔ اسی لئے تو میں انور سے کہتا ہوں کہ وہ اینٹوں کا بھٹہ . . . . !

ونود:۔ پھر وہی اینٹوں کا بھٹہ!

انور:۔ (چڑکر) ارے بھئی۔ ایک بار تم نے کہہ دیا۔ میں نے سُن لیا۔ مگر تم ہو بکے چلے جاتے ہو۔ بڑے جھکی ہو۔ جگ موہن۔ بھیا میں ضرور ابّا سے لڑوں گا ضرور لڑوں گا۔ اینٹوں کے بھٹے پر کام کرنے نہیں جاؤں گا۔ نہیں جاؤں گا . . . (وقفہ) مگر ایک بات تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا تمہارے والد کی پرائیویٹ زندگی تمہاری پرائیویٹ زندگی پر اثر انداز نہیں ہوتی؟

جگ موہن :۔ بالکل نہیں۔ میرا ذہن۔ میری تعلیم، میرا اخلاق پتاجی سے بالکل الگ ہے۔ مختلف ہے۔ مجھے طوائفیت سے پرانے سامنتی نظام سے کوئی تعلق نہیں۔ میں تو طوائفیت کو مٹا کر عورت اور مرد دونوں کو برابر کا درجہ دینا چاہتا ہوں۔ میں تو ایک ایسا سماج چاہتا ہوں۔ جہاں طوائف کا وجود ہی نہ ہو۔ جہاں کوئی کسی پر ظلم نہ کر سکے۔ جہاں سب برابر ہوں۔ انور بھائی۔ تم میرے قول و فعل میں کبھی تضاد نہ پاؤ گے۔ یہ فلسفۂ زندگی میری حیات کا جزوِ عظیم ہے۔

رمبھا :۔ (تالی پیٹتے ہوئے) Hear! Hear

جگ موہن :۔ (آپے سے باہر ہو کر) بس اب تم — اپنے کمرے میں چلی جاؤ!

رمبھا :۔ (بھولپن سے) ڈارلنگ! میں تو تمہیں شاباش دے رہی تھی۔

جگ موہن :۔ ہاں تو — وہ تو سب ٹھیک ہے۔ مگر تم بس اب یہاں سے چلی جاؤ (نرمی سے) دیکھو۔ آج شام کو ہمیں Vinotehka بھی دیکھنا ہے۔ بڑی خوبصورت تصویر ہے اور اس سے پہلے لیڈی دانا منگیر کے ہاں چائے بھی ہے اور — اس وقت ساڑھے پانچ ہیں۔ جاؤ لباس تبدیل کر آؤ۔ ڈارلنگ!

رمبھا :۔ اچھا — تو — انور بھائی۔ رخصت (وقفہ) وہ اینٹوں کا بھٹہ کہاں ہے

انور :- دلیپ پور میں، یہاں سے بیس کوس پر
رمبھا :- کسی دن میں اور جگ موہن تم سے ملنے آئیں گے وہاں!
انور :- شکریہ ــــ ایں ــــ مگر سُنئے تو میں تو وہاں نہیں جا رہا . . . .
رمبھا :- (دور سے) گڈ بائی
انور :- بھابی بھی عجیب باتیں کرتی ہیں!

(منشی جی اور پاسی کسان اندر داخل ہوتے ہیں)

منشی جی :- اے حضور - یہ پاسی کسان ہے - دھیتے گاؤں کا مکھیا!
پاسی :- (پوربی لہجے میں) رام رام چھوٹی سرکار!
جگ موہن :- (لاپرواہی سے) رام رام ہے (منشی جی) اسے سیٹھ جی کے پاس لے جاؤ!
منشی جی :- حضور سیٹھ صاحب تو اس وقت مل نہیں سکتے - آپ جانتے ہیں - ہی ہی ہی!!!
جگ موہن :- (رکھائی سے) اوہ ہاں - اچھا بتا - تو کیا کہنا چاہتا ہے!
منشی جی :- غریب پرور - یہ اپنے گاؤں کا مکھیا ہے - گاؤں والے اب کے لگان نہیں دینا چاہتے - ہی ہی ہی!
جگ موہن :- (حیرت سے) لگان نہیں دینا چاہتے!
پاسی :- (پوربی لہجے میں) سرکار اب کے فصل نہیں ہوئی - بارش کی ایک بوند

نہیں بر سی۔ لگان کہاں سے دیں سرکار۔ اس دفعہ معافی مل جائے۔ تو اگلی بار سب کچھ چکا دیں گے سرکار۔

جگ موہن :۔ لیکن لگان کیسے معاف ہو سکتا ہے؟ کم از کم میں اس معاملے میں کیسے دخل دے سکتا ہوں سیٹھ جی جانیں۔

پاسی :۔ سرکار آپ ہمارے چھوٹے راجہ ہیں۔ آپ کی تعریف ہم نے بہت سنی ہے۔ آپ سب کو برابر سمجھتے ہیں سرکار۔ گاؤں میں آپ کے دھرم کی بہت چرچا ہے۔ سرکار آپ ظلم کے خلاف ہیں۔ ہم غریبوں کے مائی باپ ہیں!

جگ موہن :۔ لیکن لگان کا معاملہ اور ہے پاسی!

منشی جی :۔ یہی میں بھی اسے دوپہر سے سمجھا رہا ہوں۔ مگر یہ کچھ سمجھتا ہی نہیں حضور فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست۔

جگ موہن :۔ (چونک کر) کیا کہا؟

منشی جی :۔ جی کچھ نہیں! فارسی کا ایک محاورہ تھا!

جگ موہن :۔ (مسکرا کر) منشی جی۔ آپ بھی بڑے اولڈ فیشنڈ ہیں!

منشی جی :۔ (آہ بھر کر)۔ جی ہاں سرکار۔ وہ زمانہ لد گیا

پاسی :۔ تو لگان معاف نہیں ہوگا؟

منشی جی :۔ تمہارا لگان معاف کر دیں تو ہمارا کام کیسے چلے پاسی!

پاسی :۔ تم چپ رہو جی۔ میں اپنی سرکار سے پوچھ رہا ہوں! سرکار ؟

جگ موہن :۔ نہیں پاسی زندگی کی ایک چُول ہلا دینے سے ساری زندگی نہیں بدل جاتی۔ تمہیں لگان دینا ہوگا۔ ہمیں لگان لینا ہوگا۔ اس وقت تک جب تک کہ زمانہ نہ بدل جائے۔ انسانیت نہ بدل جائے۔ اخلاق نہ بدل جائے!

پاسی :۔ مگر زمانہ کون بدلے گا سیٹھ صاحب! سرکار آپ ہی بدلیں تو بدلیں (وقفہ) بڑی اُمید لے کر آئے تھے ہم!

جگ موہن :۔ ہم اکیلے لگان معاف بھی کر دیں تو اس سے کچھ نہ ہوگا۔ جب تک تاریخ کا بہاؤ نہ بدل جائے۔

پاسی :۔ تاریکھ کا بھاؤ؟ ریکھ کا بھ ڈ سنا تھا۔ گندم، جوار، باجرے کا بھاؤ سُنا تھا۔ پر تاریکھ کا بھاؤ؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ سرکار؟

منشی جی :۔ چلو پاسی کسان۔ تکرار فضول ہے۔ ہم دونوں اولڈ فیشنڈ ہیں۔ ہی ہی ہی!!!

پاسی :۔ (جاتے جاتے) بڑی اُمید لے کر آئے تھے۔۔۔ رام رام سرکار۔۔۔ جرا گور (غور) سے دیکھئے گا سرکار۔ دو چار دن میں کہیں تاریکھ کا بھاؤ اوپر نیچے نہ ہو جائے۔ (چلا جاتا ہے)

(انور اور ونود دونوں ہنس رہے ہیں)

جگ موہن :۔ (اُداس لہجے میں) تم ہنس رہے ہو۔ میرا دل رو رہا ہے۔

انور :- اچھا بھئی جگ موہن۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ دلچسپ آدمی ہو۔ ہم چلے۔

جگ موہن :- کہاں ؟

انور :- وہیں - اینٹوں کے بھٹے پر !

جگ موہن :- ایں ! تو — تم نے فیصلہ کر لیا

انور :- ہاں بھئی - دیکھ لیا - ایک آدمی کی زندگی دوسرے آدمی کی زندگی پر ضرور اثر انداز ہوتی ہے . . . اچھا رخصت !

ونود :- ٹھہرو - میں بھی چلتا ہوں !

جگ موہن :- تم بھی ؟ کہاں چلے -

ونود :- کپڑوں کی دکان پر، عریانیت ڈھانپنے کے لئے (ہنستا ہے) اچھا رخصت !

(انور اور ونود چلے جاتے ہیں (وقفہ) رمبھا آتی ہے)

رمبھا :- سب چلے گئے -

جگ موہن :- (اداس لہجے میں) ہاں سب چلے گئے۔ اپنے آدرش کو چھوڑ کر غلیظ، گندی، پرانی زندگی میں واپس چلے گئے -

رمبھا :- (آہستہ سے) یہاں سب گندے ہیں ! یہاں سب غلیظ ہیں !

جگ موہن :- کیا کہا (وقفہ) ایں — رمبھا ؟ یہ تم نے کیسا بلاؤز پہنا ہے !

رمبھا :- (ملائم) خوبصورت ہے نا -

جگ موہن :- خوبصورت و شانے ننگے ہیں۔ گہرا کٹا ہوا ہے اور سینہ بھی . . . !!!

رمبھا :- (ملائم) تم تو زندگی کو اس کے اصلی رُوپ میں دیکھنا پسند کرتے ہو۔

جگ موہن :- (غصّے سے) مگر یہ تو عریانی ہے۔

رمبھا :- (بلّی) تم تو عریانی پسند کرتے ہو ناجی!

جگ موہن :- (خفا) پسند کرتا ہوں۔ دوسری عورتوں میں۔ اپنی بیوی میں نہیں۔

رمبھا :- (ہنس کر بھولپن سے) تو یہ بلاؤز اتار دوں؟

سیٹھ جی :- (فوراً دُور سے باوازِ بلند) جگ موہن! . . . جگ موہن!! (قریب آکر) جگ موہن بیٹا۔ کہاں چلے . . . !

(دیوان خانے سے نکل کر سیٹھ جی ڈرائینگ روم میں آگئے ہیں)

جگ موہن :- پتاجی۔ وہ لیڈی رامنگیر کے ہاں آج چائے ہے۔

سیٹھ جی :- ارے ہاں ٹھیک . . . ٹھیک . . . وہاں ضرور جاؤ — اور سُنو! سر رامنگیر سے اینٹوں کے بھٹے کے بارے میں ضرور گفتگو کرنا ہے۔ وہ ٹھیکہ تمہارے دوست انور کے والد کو ملنے والا ہے۔ لیکن اگر تم کوشش کرو . . . .

جگ موہن :- بہت اچھا۔ پتاجی!

(رمبھا اپنے کمرے کی طرف جا رہی ہے سیٹھ اس کی طرف مڑ کر کہتا ہے)

سیٹھ جی:۔ کہاں جارہی ہو بیٹا؟
رمبھا:۔ (رُک کر) جی ابھی آئی!

(چلی جاتی ہے)

سیٹھ جی:۔ (جگ موہن سے رازدارانہ لہجے میں ہنس کر) ہی ہی۔ آج رمبھا بھی وہی بلاوز پہنے تھی جو چھمیا نے پہنا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا ہے۔ دونوں کا درزی ایک ہے (ہنستا ہے) جگ موہن۔ کتنی عجیب بات ہے۔ کہ آج کل شریف زادیاں طوائف دکھائی دیتی ہیں اور طوائفیں شریف زادیاں

(بے اختیار ہنستا ہے)

جگ موہن:۔ (غصّے کو دباتے ہوئے) رمبھا۔ وہ بلاوز تبدیل کرنے گئی ہے پتا جی۔

سیٹھ جی:۔ ارے بھئی! تم ناراض ہو گئے۔ میں تو مذاق کر رہا تھا (وقفہ) دیکھو تم رمبھا کی باتوں میں زیادہ دخل نہ دیا کرو۔ ہر شخص کی اپنی پرائیویٹ زندگی ہوتی ہے۔ رمبھا جس طرح کا لباس چاہے پہن سکتی ہے۔ وہ اپنے لباس کو تم سے بہتر سمجھتی ہے۔ سُنا!

جگ موہن:۔ جی

سیٹھ جی:۔ (منشی جی کو اندر آتے دیکھ کر) کیا بات ہے منشی جی!

منشی جی:۔ جی وہ — ویسمے گاؤں کا مکھیا کھڑا ہے کب سے۔ لگان معاف کرانے

کے لئے۔ کہتا ہے اب کے بارش نہ ہونے کی وجہ سے فصل نہیں ہوئی۔

جگ موہن :۔ (سختی سے) میں نے انکار کر دیا ہے پتا جی

سیٹھ جی :۔ بارش نہیں ہوئی ؟ — تو آدھا لگان معاف کر دیتے بیٹا . . . .
یہ ریاست کا معاملہ ہے۔ کبھی سختی، کبھی نرمی۔ یہی قاعدہ ہے یہاں۔ ہمیشہ
موقع و محل دیکھ کر کام کرنا چاہئے! بیٹا . . . . (رمبھا آتی ہے) لو وُہ
رمبھا بلاؤز تبدیل کر آئی!

منشی جی :۔ جی چھوٹی سرکار تو —!

سیٹھ جی :۔ ہاں میں جانتا ہوں۔ جگ موہن بڑا اولڈ فیشنڈ ہے۔ باتیں بہت
بناتا ہے : (جگ موہن کا شانہ تھپک کر) مگر ہے آخر اپنے باپ کا بیٹا!
(ہنستا ہے)

رمبھا :۔ (بہت آہستہ سے) یہاں سب گندے ہیں۔ یہاں سب غلیظ ہیں!

جگ موہن :۔ کیا کہا

رمبھا :۔ کچھ نہیں۔ (ہنستی ہے)

جگ موہن :۔ پتا جی آپ رمبھا کو سمجھا دیجئے۔ یونہی موقع بے موقع ہنستی ہے
(رمبھا کھلکھلا کر ہنستی جاتی ہے)

فیڈ آؤٹ

گواہ

مرحوم کے متعلق تم کیا جانتے ہو؟

مرحوم؛ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

مرحوم کا نام کیا تھا؟

مرحوم کا نام رام بھیجا۔ خدا بخش۔ گوردیال سنگھ۔ اینتھی لال، ابراہیم، تامنگ پاؤ۔ کرنکن تھا۔ لیکن مرحوم مرتے وقت صرف مرحوم ہو کر رہ گئے تھے۔

مرحوم کی عمر کیا تھی؟

مرحوم بچوں میں بچے۔ جوانوں میں جوان اور بوڑھوں میں بیٹھ کر بوڑھے بن جاتے تھے۔ اس لئے آج تک اُن کی عمر کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکا۔ ہاں قیاس

غالب ہے کہ مرحوم کو موت کے ظالم ہاتھوں نے ہم سے بے وقت چھین لیا۔ مرنے کی اُن کی عمر نہ تھی۔ مرحوم کی عمر کے متعلق اس سے زیادہ کسی کو معلوم نہیں

مرحُوم کے اوصاف و فضائل بیان کرو؟

مرحُوم کے اوصاف "حسنہ" اور فضائل "حمیدہ" تھے۔ اس کے علاوہ وہ "فرشتہ سیرت"۔ "نیک طینت" اور "مرنجان مرنج" بھی تھے۔ قدرت نے انہیں بہترین "ادبی ذوق" سے متصف کیا تھا۔ لیکن افسوس کہ فلک کج رفتار نے ...

اچھا۔ اچھا— اب یہ بتاؤ کہ مرحوم کا حُلیہ کیسا تھا۔

مرحوم بڑے گورے چٹّے۔ وجیہہ۔ دوہرے بدن کے آدمی تھے۔ کہتے ہیں کہ بچپن میں مرحوم ایسا خوبصورت بچہ سارے شہر میں نہ تھا۔ جوانی میں مرحوم ایسا گبرو جوان چراغ لے کر ڈھونڈے سے نہ ملتا تھا۔ بڑھاپے میں اُن کے چہرے پر ایسا نور برستا تھا کہ اُن کی طرف دیکھنا بھی محال ہو چلا تھا۔ مرتے وقت لوگ دُوربین یا خوردبین لگا کر دیکھتے تھے۔ جلال کا یہ عالم تھا۔ اس کے علاوہ مرحوم کا چہرہ سنولایا ہوا تھا بلکہ سیاہ تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ اور چہرہ کتابی تھا جس سے فطری ذہانت کا اظہار ہوتا تھا۔

مرحوم کا باطن کیسا تھا؟

مرحوم کے ظاہر اور باطن میں کوئی فرق نہ تھا۔

مرحوم کہاں رہتے تھے؟

مرحوم اسی کرۂ ارض پر رہتے تھے۔ لیکن جب مر گئے تو خلا آشیانی ہو گئے۔

مرحوم کی عادات کے بارے میں تم کچھ کہہ سکتے ہو؟

مرحوم بڑے وضعدار تھے۔ وضعداری کو نبھاتے نبھاتے مرحوم ہو گئے۔ مرحوم بچوں اور جوانوں سے بڑی شفقت و محبت سے پیش آتے تھے اور بزرگوں کا احترام کرتے تھے۔ لیکن ان میں خودداری بہت تھی۔ اس لئے کبھی گھر سے باہر نہ نکلتے تھے۔ مرحوم بڑے فیاض تھے۔ لیکن افسوس کہ غریبی نے اُن کے اس جوہر کو پنپنے نہ دیا۔ پھر بھی وُہ اپنی سی کر گزرتے تھے۔ مرحوم جھونپڑے میں رہتے تھے، بنگلے میں رہتے تھے۔ محل میں رہتے تھے۔ لیکن جہاں کہیں بھی وُہ رہتے تھے۔ ہمیشہ خدا کو یاد کرتے تھے۔ مرحوم بڑے خوش گفتار تھے۔

خوش گفتار؟

جی ہاں۔ جب مرحوم بات کرتے تھے تو اُن کے مُنہ سے پھُول جھڑتے تھے

کیا اُنہوں نے اپنے مُنہ کے اندر پھُولوں کے گملے چھپا رکھے تھے۔

جی ہاں۔ اور اس کے علاوہ جب وُہ ہنستے تھے تو موتی برستے تھے

آپ نے کتنے موتی چُنے؟

ہزاروں! لاکھوں!!

تو پھر تو آپ بہت امیر بن گئے ہوں گے۔ کتنا انکم ٹیکس دیتے ہیں آپ۔

جی کچھ بھی نہیں۔ وُہ سارے موتی میں نے ہا ریں پرو کر مرحوم کی قبر پہ

چڑھا دیئے۔

اچھا تو کیا وہ دفنائے گئے تھے؟

جی ہاں، وہ دفنائے گئے تھے۔ جلائے گئے تھے۔ بہائے گئے تھے پھانسی پر لٹکائے گئے تھے۔ ان کے جسم کا گوشت و پوست چیل کوؤں نے کھایا تھا۔ لیکن مرتے وقت اُن کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ تھی۔ گویا زندگی نے موت پر فتح پالی ہو۔

مرحوم کا رویہ شہر کے لوگوں کے ساتھ کیسا تھا؟

مرحوم کی نظروں میں امیر و غریب، تاجر و گدا، عورت اور مرد سب برابر تھے۔ وُہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک آنکھ سے دیکھتے تھے۔ کالے اور گورے، جنگی اور برہمن کی تفریق سے واقف نہ تھے۔ تعصب تو انہیں چھو تک نہیں گیا تھا۔ اس کے علاوہ انہیں نیک و بد کی بھی تمیز نہ تھی۔

مرحوم کا اُٹھنا بیٹھنا کن لوگوں میں تھا؟

مرحوم بڑے آزاد۔ لااُبالی، فقیر خش آدمی تھے۔ اس لئے اکثر اکیلے ہی رہتے تھے۔ اور چرس کا دم لگاتے تھے۔ انہیں مکروہاتِ دُنیا سے نفرت تھی۔ اس لئے زندگی میں بہُت کم لوگوں نے ان سے راہ و رسم پیدا کی۔

مرحوم کے دشمنوں کو تم جانتے ہو؟

بڑی اچھی طرح سے۔ مرحوم کا سارا شہر دشمن تھا۔

اور جب وُہ مرے تو۔

تو وُہ اخبار بھی جنہوں نے زندگی بھر ان کے لئے ایک سطر نہ لکھی۔ پانچ کالمی سُرخی چھاپ رہے تھے۔

جگہ جگہ لکھا ہوا تھا: "آہ مرحُوم"۔

مرحوم نے کبھی کسی سے عشق کیا؟

مرحوم کو صرف خدا سے عشق تھا۔

مرحوم کیا پیتے تھے؟

قرض کی پیتے تھے مئے۔

پھر؟

پھر ایک دن ان کی فاقہ مستی رنگ لے آئی اور وُہ بدحال و مفلوک الحال ہو گئے اور اُجڑے دیار میں رہنے لگے۔

اُس وقت تم اُن کے ساتھ تھے؟

جی نہیں۔ میں صرف اُن کے جنازے میں شریک ہُوا تھا۔

مرحوم کا اپنے مُلک کے بارے میں کیا خیال تھا؟

مرحوم کو اپنے ملک سے بڑی محبت تھی۔ لیکن افسوس کہ ملک نے ان کی قدر نہ کی۔ قوم نے ان کو نہیں پہچانا۔ ہائے افسوس۔

مرحوم کا دل کیسا تھا؟

مرحوم کا دل بڑا حساس تھا۔ مرحوم کا دل ایک شفاف آبگینے کی طرح تھا۔ مرحوم کسی دوسرے کو تکلیف میں دیکھ کر خوش نہ ہو سکتے تھے۔ مرحوم کا دل چوٹ کھایا ہوا تھا۔ ایک کافر ادا نے انہیں ایسا چرکہ دیا کہ وُہ اسے عمر بھر نہ بھلا سکے اور آخر اسی رنج میں گھل گھل کر جان دے دی۔

اس عورت کا کیا نام تھا؟

مرحومہ! خدا بخشے بڑی سلیقے والی تھی۔ اُس کے حُسن و جمال کا شہرہ ــــ

مرحومہ کی نہیں مرحوم کی بات کرو۔ یہ بتاؤ کہ مرحوم کیا کرتے تھے؟

مرحوم سب کام کرتے تھے۔ وُہ شاعری کرتے تھے۔ فوج میں بھرتی تھے۔ کلرکی کرتے تھے۔ ہل جوتتے تھے۔ دوکانداری کرتے تھے۔ مزدوری کرتے تھے۔ چارپائیاں بنتے تھے۔ پان کی دوکان کرتے تھے۔ تانگہ چلاتے تھے۔ مرحوم مصنّف تھے، مرحوم پبلشر تھے۔ مرحوم دلّال تھے۔ مرحوم کوکین فروش تھے۔ لیکن مرحوم جو کام بھی کرتے تھے۔ اُسے حدِ کمال تک پہنچا دیتے تھے۔ مرحوم نے اپنی زندگی میں سب کام کئے۔ لیکن جب وُہ مرے تو صرف ہچکیاں لے رہے تھے۔ اور اُن کے اعزہ و اقارب ان کے سرہانے کھڑے رو رہے تھے۔

مرحُوم کس طرح مرے؟

مرحُوم انتقال فرما کر اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے اور پھر ان کی رُوح

قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ اِنّا للہِ وَانّا اِلَیہِ رَاجِعُون ط

مرحوم کا ثانی کون ہے؟

مرحوم کا ثانی روئے زمین پر کوئی نہیں۔

مرحوم کی جگہ کون پُر کرے گا؟

مجھے تو اُن کی جگہ پُر کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ حضورِ پُر نور کی ہستی کے سوا مجھے تو ——

اچھا —اچھا— اب تم جا سکتے ہو۔

شکریہ۔

ٹھہرو —— ٹھہرو —— ایک سوال رہ گیا۔ تم مرحوم کو کب سے جانتے ہو؟

میں؟ میں مرحوم کو اُس دن سے جانتا ہوں۔ جس دن انہیں موت آئی اور وہ —— مر گئے۔ آہ!

مرحوم! کیا بتاؤں۔ ع

"خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"

ردّی

تعریف:-

یہ غلط ہے ـــــ کہ ہر بُری اور رذیل شے کو ردّی کہتے ہیں۔ دراصل ردّی صرف اُسی شے کو کہا جاتا ہے۔ جو ردّی ہو اور یہی ردّی کی تعریف ہے

مثال:-

یہ مضمون کیسا ہے؟ ردّی!

یہ افسانہ نگار کیسا ہے؟ ردّی! (مؤذن مرحبا بہ وقت بولا۔ تری آواز۔)

ردّی!

یہ ڈاکٹر کیسا ہے؟ ردّی!

یہ کپڑا کیسا ہے؟ ردّی!

یہ کھیل کیسا ہے؟ ردّی!!

یہ کاغذ کیسا ہے؟ ردّی!!!

یعنی اگر بُری سے بُری شے کی بُری سے بُری حالت دکھانی مقصود ہو۔ تو بھی اُسے ردّی ہی کہیں گے۔ ردّی نہ گھٹانے سے گھٹتی ہے نہ بڑھانے سے بڑھتی ہے۔ بلکہ ہر جگہ، ہر حالت میں ردّی ہی رہتی ہے۔ اگر ردّی میں ردی جمع کر دیجئے۔ تو کل میزان ردّی ہوگی۔ اگر ردّی میں سے ردی نکال لیجئے تو بقایا پھر ردّی ہے اگر ردّی کو ردّی سے ضرب دیجئے تو حاصل ضرب ردّی ہے۔ اگر ردّی کو ردّی پر تقسیم کیجیے۔ تو بھی آخر ردی حاصل ہوگی۔ ردّی کا ذو اضعافِ اقل بھی ردّی اور ردّی کا عادِ اعظم بھی ردّی۔ اور دنیا میں یہ فخر صرف ردّی ہی کو حاصل ہے! گویا ردّی بھی مادّے کی طرح اٹل ہے۔ ایک ہی صفت، ایک ہی وزن، ایک ہی خوبی کی مالک ہے... ردّی!

جنگ سے پہلے ردّی کی حالت غیر تھی۔ ہر شخص اس سے نفرت کرتا تھا۔ ردّی کا نام ذہن میں آتے ہی زندگی کے تمام گھناؤنے پہلو اپنے بدصورت نگار خانوں کو لئے تخیل میں آموجود ہوتے تھے۔ ردّی کا ذکر آتے ہی اُن کباڑ خانوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ جہاں پر کرم خوردہ کتابیں ہنس کے ٹوٹے ہوئے بلّے، کوڈ، سہ رنگی تصویروں والے رسالے اور اخبار، چینی کے ٹوٹے ہوئے برتن، مرمر کے شکستہ بُت، میزیں

جنہیں دیمک چاٹ گئی تھی اور سڑے ہوئے ربڑ کی بوتلیں جن میں کسی زمانے میں گرم پانی بھرا جاتا تھا۔ رکھی رہتی ہیں یا پنساری کی وہ دکان جہاں ہلدی کے انبار ماونٹ ایورسٹ کی چوٹی کی طرح بلند ہوتے اور دارچینی اور قہوہ اور الائچی اور نمک پسا ہوا بکتا۔ ردّی کے ساتھ ہمیشہ ردّی چیزوں کا خیال آتا تھا۔ دراصل یہ ردّی کی خاصیت ہے۔ اس کا کیمیائی عمل یہ ہے کہ جس چیز کو چھوتی ہے۔ اُسے بھی ردّی بنا دیتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک طرح کا پارس پتھر ہے۔ میں نے ہزار بار کوشش کی۔ لیکن ردّی دیکھ کر یا ردّی کا خیال کرتے ہوئے بھی میرے ذہن میں کبھی مئے خوش رنگ، لب لعلیں، سنبل وریحان، چشمِ آہو کی یاد تازہ نہیں ہوتی۔ اگر یاد آتی بھی تو باسی پکوڑیوں کی سڑے بُسے شامی کبابوں کی، یا اُس پرانے جوتے کی جسے میں موچی کے پاس کئی بار مرمت کرانے لے جاتا ہوں۔ اس پر میری یہ ہمت کہ ردّی کی تعریف میں مضمون لکھ رہا ہوں۔ میری جرأت کی داد دیجئے۔ فرہاد کی کوہکنی بھی اس کے مقابلے میں ہیچ ہے یعنی بالکل ردّی ہے!

موجودہ عالمگیر جنگ سے پہلے نہ صرف ردّی مضمون لکھنے والوں یا ردّی پر مضمون لکھنے والوں کی حالت غیر تھی۔ بلکہ ردّی کے متعلق کسی قسم کی تجارت کرنے والوں کا حال پتلا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ جب میں مہینے کی ہر پندرھویں کو جیب ٹٹولتا اور جیب میں سگریٹ کے بھی پیسے نہ پاتا تو ناچار ردّی کا رُخ کرتا۔ اُس وقت منوں ردّی بیچ کر بھی سگریٹ کے پیسے حاصل نہ ہوتے تھے۔ بہت ہُوا تو ایک پیکٹ خرید لیا

کونڈر کا۔ اس شان سے گویا حاتم طائی کی قبر لات ماردی۔ میرا مطلب ہے۔ ردّی ماردی اور اگر ردّی بیوی کے ہتھے چڑھ گئی تو وہ ننھے کے لیے جھنجھنا خرید لیتی تھی اور ایک بار تو شاید ربڑ کی سالم گڑیا ردی کے عوض میں ملی تھی۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو جھنجھنے اور ربڑ کی گڑیا سے زندگی کا سودا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے ردّی کی تجارت میں کوئی خاص نفع نہ تھا۔ ردّی بیچنے والوں کا بازار الگ تھا۔ وہاں اکثر چوہوں کی بہتات رہتی۔ اُنہیں کوئی عزت کی نگاہ سے نہ دیکھتا تھا۔ میرا مطلب ردّی بیچنے والوں سے ہے۔ چوہوں سے نہیں۔ کباڑیئے اور میونسپل کمیٹی کی کوڑا کرکٹ کی لاری کا ڈرائیور اور گلی گلی ردی بیچنے والے تو خیر بُرے تھے۔ لیکن ہم لوگ بھی جو کبھی کبھار ردّی بیچتے تھے۔ بُری نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ کمینہ، کم ظرف، خسیس، ردّی تک بیچ ڈالتا ہے۔ اور اس قسم کے القاب سے یاد کئے جاتے۔ جنگ سے پہلے میں اگر یہی ردّی پر مضمون لکھتا۔ تو ایڈیٹر فوراً اسے ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیتا۔ جو عموماً ایڈیٹر کی میز کے نیچے اُس کے قدموں میں رکھی ہوتی ہے کہ عورت اور ردّی کا یہی ٹھکانہ ہے اور ردّی پر جو مضمون ہو۔ اُس کا حشر بھی یہی ہونا چاہیئے۔

لیکن یہ سب جنگ سے پہلے کی باتیں ہیں۔ اب حالات بدل گئے ہیں۔ اب صرف اچھے مضمون ردّی کی ٹوکری میں پھینکے جاتے ہیں اور ردّی کی ٹوکری بھی میز کے نیچے نہیں بلکہ میز کے اُوپر ایڈیٹر کے سامنے رکھی رہتی ہے اور ردّی کا ایک ایک پُرزہ

اس میں احتیاط سے گن کر ڈالا جاتا ہے۔ بینک کا مینجر بھی نوٹوں کو اس احتیاط سے نہیں گنتا کہ جس احتیاط سے یہ ردّی گنی جاتی ہے۔ خدا بارہ برس کے بعد ردّی کی بھی سُنتا ہے۔ بلکہ بیس برس ہی سمجھئے۔ کیونکہ پچھلی جنگِ عظیم غالباً ۱۹۱۸ میں ختم ہوئی تھی۔ کچھ ٹھیک طرح سے یاد نہیں۔ حساب کر لیجئے۔ ہم نے اگر تاریخ کا مطالعہ کیا ہوتا تو کیا ردّی پر ہی مضمون لکھتے ؟

جنگ میں عموماً یہ ہوتا ہے کہ چیزیں مہنگی ہو جاتی ہیں اور آدمی سستے ہو جاتے ہیں۔ چاہے یہ جنگ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ہو یا جمہوریت کے خلاف، یا فسطائیت کے خلاف یا جاگیرداروں کے خلاف۔ جنگ کا یہ ایک ایسا اقتصادی پہلو ہے جس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ امر اتنا ہی آسان اور بدیہی ہے جیسے دو اور دو چار ہوتے ہیں اور نو دو گیارہ ہوتے ہیں اور جنگ میں صرف ہندسے ہی نہیں بلکہ لوگ بھی نو دو گیارہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن خیر ہر جنگ میں یہ قربانی ناگزیر ہے۔ اس قربانی کے بغیر ظلم کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

اسی لئے انسان کو مہنگائی بھی ایک حد تک گوارا ہو جاتی ہے لیکن ایک حد تک، اور جب مہنگائی اس حد سے تجاوز کر جائے تو بڑی مضحکہ خیز بات بن جاتی ہے عموماً اس مضحک صورت کو جنگی مزاح کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک مضحک صورت تو یہ ہے کہ آدمی سترہ روپے میں بکتا ہے اور جوتا اٹھارہ روپے میں۔ اور ایک اچھا جوتا اڑتالیس روپے میں۔ پہلے اڑتالیس روپے میں ایک بھینس

آتی تھی۔ اب اتنے روپوں میں تین آدمی بکتے ہیں۔

کوئلہ لیجئے۔ کوئلے کا بھاؤ جو بڑھنے لگا تو گیہوں کے برابر ہو گیا بازار جایئے تو کوئلہ بھی اُسی بھاؤ میں ملتا ہے جس بھاؤ گیہوں۔ اب چاہے کوئلہ کھایئے چاہے گیہوں۔ چاہے گیہوں جلائیے چاہے کوئلہ۔ پھر کوئلے کا بھاؤ جو بڑھنا شروع ہوا تو گندم سے دُگنا ہو گیا۔ یعنی اب اشرفیاں لٹیں اور کوئلوں پر مُہر میں زیادہ فائدہ نظر آنے لگا اور لوگوں نے یہ مناسب سمجھا کہ وُہ کوئلے کی بجائے گیہوں جلائیں، پھر جب گیہوں بھی نہ ملا۔ تو وُہ اپنا جی جلانے لگے اور جب بالکل ہی جی جان سے گزر گئے۔ تو گئے دونوں جہان نظر سے گذر۔ تو ی صورت کا کوئی بشر نہ ملا۔ پڑھنے لگے

یہی حال تانبے کا ہوا۔ یعنی جب تانبے کا بھاؤ بڑھنے لگا تو اس قدر بڑھا کہ بازار میں پیسہ تک دیکھنا مشکل ہو گیا۔ بھاؤ اس قدر بڑھا کہ چاندی سے بھی بڑھ گیا۔ پھر کیا تھا لوگوں نے بینکوں سے اپنے چاندی کے زیور نکلوا لیئے اور اُن کی جگہ تانبے کے برتن رکھ دیئے۔ پھر روئی کا بھاؤ جو بڑھنا شروع ہوا تو سونے کے بھاؤ سے بھی بڑھ گیا۔ میں نے اُسی دم اپنی بیوی کے سونے کے زیور بیچ دیئے اور اپنے گھر کے توشک اور لحاف بینک میں محفوظ کرا دیئے۔ کون جانے بھئی۔ کس دم کیا ہوتا ہے۔ میاں یہ جنگ ہے۔ اپنا مال بینک میں محفوظ کرا دو۔ ہاں!

اور پھر کاغذ! ہاں صاحب کاغذ بھی دُون کی لینے لگا۔ یہ ذلیل چیتھڑا جو بانس کے ریشوں اور میلے کچیلے کپڑوں سے بنتا ہے۔ یہ بھی صاحب کیا بتاؤں، آسمان سے

باتیں کرنے لگا۔ اُس کا بھاؤ جو اُوپر چڑھنا شروع ہوا تو کوئلے اور گیہوں کے بھاؤ سے بھی بڑھ گیا۔ مجھے وُہ زمانہ اچھی طرح یاد ہے۔ ان دنوں رسالوں کے مالک اور ناشر لوگ بہت پریشان تھے۔ خریدار کتابیں اور رسالے مانگتے تھے اور ناشر کہتے تھے دو سیر گیہوں لے لو۔ تین سیر کوئلہ لے لو۔ لیکن رسالہ یا کتاب نہ طلب کرو۔ مضمون نگار اپنا مضمون حفظ کرکے ایڈیٹر کو سناتا تھا اور اگر ایڈیٹر کو وُہ پسند ہوتا تو وُہ مضمون — میرا مطلب ہے۔ مضمون نگار کو کاتب کے حوالے کر دیتا اور مضمون نگار پھر کاتب کو اپنا مضمون سُناتا۔ جب جاکر کاتب کتابت شروع کرتا۔ بعد میں جب کاغذ اور بھی گراں ہوگیا تو کاتب کو بھی مضمون حفظ کرنا پڑا اور وُہ لیتھو کے پریس میں جاکر حروف کندہ کرتا اور اس طرح کہیں جاکر پرچہ چھپتا تھا۔

لیکن کاغذ کی گرانی اور بھی بڑھتی گئی اور کاغذ کی قیمت کپڑے سے بھی بڑھنے لگی۔ ان دنوں میں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہندو مسلم کی مناسبت سے ہندو اخبار اپنے خریداروں کو اخبار کی بجائے ایک دھوتی دیا کریں اور مسلمان اخبار لٹھے کی شلوار۔ اور جو ادبی پرچے ہوں۔ وُہ کاغذ کی بجائے کپڑے پہ چھپیں۔ کپڑے ہی کی مضبوط جلد ہو اور کپڑے ہی کے ورق، پاپلین کے ورق، یا لٹھے کے ورق، یا سپید ریشم کے ورق اور رنگین چھینٹوں پر سہ رنگی تصاویر شائع ہوں۔ اعلانات اس قسم کے ہوں:۔

"رسالہ ساقی پڑھئے۔ کورے لٹھے پہ شائع ہوتا ہے۔ خالص پاپلین کی

جلد ہے۔ جسے دیکھ کر آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں۔ ساقی بجلوۂ دشمن و ایمان آگہی"

"رسالہ ہمایوں ہر یکم تاریخ کو نہایت باقاعدگی سے چھبیس نمبر کی ململ پر شائع ہوتا ہے۔ اس رسالے نے آج تک کبھی کھدر استعمال نہیں کیا۔ دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا!"

"رسالہ ادب لطیف پڑھئے۔ ہندوستان کا واحد ترقی پسند ماہنامہ ہمیشہ ہات کا بُنا ہوُا دوسوتی کپڑا استعمال کرتا ہے۔ رسالہ ادب لطیف پڑھئے اور اپنے مُلک کے جولاہوں کی مدد کیجئے۔ مزدور کسان زندہ باد!"

پہلے پہل صرف سگرٹوں کے پیکٹ لوٹائے جاتے تھے۔ پھر کپڑوں پہ چھپے ہوئے رسالے بھی لوٹائے جانے لگے۔ بصورتِ دیگر ناشر لوگ نئی کتابیں اور نئے رسالے دینے سے انکار کر دیتے تھے۔ ان پُرانے رسالوں کو لانڈری میں بھیج دیا جاتا۔ جہاں سے یہ رسالے دُھلے دُھلائے واپس آجاتے اور پھر مطبع میں چھپ کر اُنہیں خریداروں کو بھیج دیئے جاتے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا کہ ہر مطبع کے سامنے رسالے دھونے والی لانڈری بھی کھُل گئی۔ آپ نے کئی جگہ اس قسم کا اشتہار پڑھا ہو گا۔

صفاچٹ لانڈری

یہاں رسالہ ساقی دھویا جاتا ہے

عید نمبر، افسانہ نمبر اور سالنامے بھی ڈرائی کلین کئے جاتے ہیں

زنانہ رسالوں کو دھونے کا خاص انتظام ہے
صفاچٹ لانڈری
سے
اپنا رسالہ، اپنی کتاب، اپنا اخبار دُھلوائیے
اور اک
نیا اخبار، نیا رسالہ، نئی کتاب حاصل کیجئے
اللہ جو شوق دے تو کتابیں پڑھا کرو!

لیکن اب وُہ زمانہ بھی تقریباً قریباً بیت چکا ہے
اب اک نیا دور آیا ہے
ردّی کی قیمت بڑھ رہی ہے۔

بازار سے اگر آپ ایلومینیم کا برتن خریدیں۔ مثال کے طور پر اگر آپ ایک دیگچی خریدیں۔ تو چھ سات روپے میں مل جائے گی۔ لیکن یہی دیگچی اگر آپ توڑ پھوڑ کر دوسرے دن کباڑیے کے پاس لے جائیں۔ تو وہ اس کے آپ کو آٹھ نو دس روپے تک دے دیگا۔ کیونکہ ایلومینیم ایک قیمتی دھات ہے۔ سب دھاتوں میں ہلکی دھات ہے۔ اس لئے ہوائی جہازوں کی تعمیر میں کام آتی ہے اور ایلومینیم اکٹھا کرنے کا اس کے سوا اور کیا طریقہ ہے کہ لوگوں سے ایلومینیم کی بے کار چیزیں مول ضرور لے لی جائیں۔ چنانچہ آج کل کئی

لوگوں نے یہی تجارت شروع کر رکھی ہے۔ وہ بازار سے نیا برتن لاتے ہیں اور اُسے توڑ پھوڑ کر سوائے یا ڈیوڑھے داموں کسی کباڑیئے یا ایلومنیم اکٹھا کرنے والوں کے پاس بیچ دیتے ہیں۔

یہی حال ردّی کا ہے

ردّی اکٹھا کرنے والوں اور ردّی بیچنے والوں کے مزے ہیں

ردّی کی قیمت اصل کاغذ سے دُگنی ہو گئی ہے۔

چنانچہ اگر آپ بازار سے ایک کتاب، کوئی ایک کتاب خرید لیجئے۔ چلئے میری کتاب ہی خرید لیجئے۔ آخر اس میں رکھا کیا ہے اور پھر اس کتاب کو خرید کر سیدھے کباڑیئے کے پاس لے جائیے۔ تو وہ اسے تول کر آپ کو دام دے گا اور میں نے دیکھا ہے کہ اس طرح سے جو قیمت آپ نے اس کتاب کی ادا کی ہے۔ اُس سے دُگنے دام آپ کو کباڑیئے سے مل جاتے ہیں۔ کیونکہ ناشر تو ابھی تک کتاب تول کر نہیں دیتے۔ وہ تو یُونہی اٹکل پچو کتاب کی قیمت لگا دیتے ہیں۔ اور کباڑیا کتاب کا مضمون دیکھ کر نہیں کتاب کا وزن تول کر قیمت لگاتا ہے۔ چنانچہ آج کل کتاب لکھنے میں یا کتاب چھاپنے میں اتنا فائدہ نہیں۔ جتنا کتاب کو ردّی بنا کر بیچنے میں۔ اس سے ایک خاص فائدہ یہ بھی ہوا ہے کہ اب نفس مضمون یا سٹائیل پر غور کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور اگر دیکھا جائے تو باقاعدہ حروف لکھنے کی بھی ضرورت نہیں۔ یہی کافی ہے

کہ آڑی ترچھی لکیریں کاغذ پر کھینچ دی جائیں اور کتاب کو پریس میں چھاپ لیا جائے اور پھر اُسے فوراً کسی کباڑیے کے ہاں فروخت کر دیا جائے۔ میں سوچتا ہوں اس طرح ایک کتاب کے ایک مہینے میں ایک نہیں درجنوں ایڈیشن نکل سکتے ہیں اور فوراً کباڑیے کے پاس فروخت کئے جا سکتے ہیں کیونکہ کورا کاغذ آج کل ردّی سے بہت سستا ہے۔ ذرا اندازہ لگائیے کہ میں دفتر سے پچھتر روپے تنخواہ پاتا ہوں۔ دس پندرہ روپے پندرہ بیس مضمون لکھ کر مہینے میں کما لیتا ہوں۔ پھر ایک درجن کتابوں کی چھ روپے رائلٹی بھی آتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود جنگ کی وجہ سے مہنگائی اس قدر زیادہ ہے کہ اگر میں ردّی نہ بیچوں تو گھر کا خرچ کبھی پورا نہ کر سکوں۔ چنانچہ ہر ماہ جو رسالے، اخبار اور کتابیں میرے پاس آتی ہیں صرف انہیں کباڑیے کے حوالے کر کے میں ایک سو، سوا سو روپیہ کما لیتا ہوں اب سوچتا ہوں۔ یہ تو بہت ہی نفع بخش تجارت ہے اور اگر ردّی کی قیمت اسی طرح بڑھتی گئی تو وہ دن دُور نہیں۔ جب مصنّف کو اپنا مسودہ ناشر کی بجائے ردّی والے کے پاس فروخت کرنے میں زیادہ فائدہ ہو گا۔ کیونکہ ردّی والا نفسِ مضمون نہیں دیکھتا۔ وزن دیکھتا ہے!

بڑے آدمی

بڑے آدمیوں کی پرستش عرصۂ دراز سے جاری ہے اور اس کے پس پردہ خوف کا وُہ جذبہ مستور ہے۔ جو کمزور کو قوی سے اور قوی کو قوی تر سے ممیز کرتا ہے ابھی تک آدمی آدمی سے ڈرتا ہے۔ محبت نہیں کرتا ہے۔ پرستش کرتا ہے۔ لیکن محبّت نہیں کرتا ہے۔ پرستش اور محبّت میں بہت فرق ہے۔

جب انسان جنگل میں رہتا تھا تو جنگل کے دوسرے جانوروں کی طرح اُس کا دل بھی شیر کی گرج سُن کر دہل جاتا تھا۔ شاید اس خوف نے شیر کے دل میں دُوسرے جانوروں کے متعلق اک جذبۂ تحقیر پیدا کر دیا۔ پھر اُدھر ڈرپوک جانوروں کے دل میں خوف و ہراس کے جذبے نے عمل معکوس کی صورت اختیار کر لی۔ شیر اب جنگل کی قوت

کا مظہر بن گیا اور انسان اُس کی پُوجا کرنے لگا۔ ابھی تک اُس کی پُوجا کر رہا ہے۔ شیرِ بنگال اور شیرِ پنجاب ہر روز اخباروں کے کالموں میں دندناتے نظر آتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ہر بڑا آدمی کسی ایک انسانی گروہ کا شیر ہوتا ہے۔ لوگ اُس کی پرستش کرتے ہیں اور وہ اپنے دل میں انہیں حقیر سمجھتا ہے اور اکثر اس امر کا مظاہرہ کیا کرتا ہے۔ لیکن سب سے مضحکہ خیز صورتِ حال وُہ ہے، جب شیر جنگل کے جانوروں سے ووٹ طلب کرتا ہے اور کہتا ہے: "میں تمہارا خادم ہوں"۔ اور جانور اس قدر بے وقوف ہوتے ہیں کہ خود خادم ہوتے ہوئے اُسے اپنا خادم سمجھنے لگتے ہیں۔ اور تالیاں بجا بجا کر اُسے ووٹ دیتے ہیں اور پہلے سے بھی زیادہ شیر کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔

جنگل کا شیر اور انسانوں کی بستی کے شیر اپنی صفات میں ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ دونوں شدید قسم کے انفرادیت پسند ہوتے ہیں۔ جنگل کا شیر اپنے علاقے میں کسی دوسرے شیر کو گھسنے نہیں دیتا۔ یہی حال انسانوں کی بستی کے شیر کا ہے۔ چنانچہ مثل مشہوُر ہے۔ ایک میان میں دو شیر نہیں رہ سکتے۔

گاندھی جی ہندوؤں کے شیر ہیں۔ جناح صاحب مسلمانوں کے۔ اوّل تو اپنے جنگل میں کوئی اُن کا حریف پیدا ہو تو سختی سے دبا دیا جاتا ہے۔ دوسرے جنگل سے آئے ہُوئے شیر کا تو معاملہ ہی اور ہے۔ اس مرحلے پر جغرافیائی وطنیت کارفرما ہوتی ہے اور ایک جنگل کے جانور دوسرے جنگل کے جانوروں پر پل پڑتے ہیں اس لئے

نہیں کہ خدانخواستہ اُنہیں دوسرے جنگل کے جانوروں سے بیر ہے۔ ہرگز نہیں! یہ تو صرف اس لئے ہوتا ہے کہ اپنے جنگل کے شیر کی عزت خطرہ میں ہوتی ہے۔ یعنی جسے ہم ڈر اور خوف کے احساس سے مغلوب ہو کر پُوجتے ہیں۔ اُس کی عزت خطرے میں ہوتی ہے۔ جب یہ لڑائی شروع ہوتی ہے تو اسے بالعموم "حق و انصاف کی لڑائی" کہا جاتا ہے۔

جنگل کا شیر اپنی رعایا کے خون پر گزارا کرتا ہے۔ انسانوں کی بستی کا شیر بھی اسی طرح پلتا اور پروان چڑھتا ہے۔ دونوں اپنی رعایا کا شکار کرتے ہیں اور اس کے عوض میں رعایا دن رات اُن کی پرستش کرتی ہے۔ وہ کہانی تو آپ نے سُنی ہوگی جب انسانوں کی ایک بہت بڑی بستی پر ایک دیو نازل ہوا تھا اور شہر سے باہر ایک کھوہ میں رہنے لگا تھا۔ پھر شہر کے راجہ چھوٹے شیر سے اُس نے معاہدہ کر لیا تھا کہ انسانوں کی بستی سے ہر روز ایک آدمی اُس کی خوراک کے لئے کھوہ میں بھیج دیا جائے گا۔ عرصۂ دراز تک انسانوں کی بستی پر دیو کا ظلم مسلط رہا اور عرصۂ دراز تک اُس بستی کے گلی کوچوں سے آہ و بکا کی صدائیں بلند ہوتی رہیں آخر ایک دن وہ آیا۔ "وہ" یعنی نجات دہندہ۔ شہزادۂ عالم۔ اور اُس نے دیو سے لڑ کر اُسے مار ڈالا اور اس طرح اُس شہر کو دیو کے چنگل سے رہائی دلائی۔ لیکن یہ پرستان کی کہانی ہے۔ انسانوں کی بستی میں ابھی وہ نجات دہندہ نہیں آیا!

بڑے آدمی

جب انسان نے جنگل سے ناطہ توڑا۔ اور وادیوں میں دریا کے کنارے کنارے اپنی بستیاں بسائیں۔ اور اپنے تمدن کو ترقی کی راہ پر چلایا۔ اُس وقت بھی وُہ شیر کے خیال سے غافل نہیں رہا۔ شیر کا خوف ابھی تک اُس کی رُوح پر مسلط ہے۔ اتنا ضرور ہوا کہ جنگل کا شیر، شہر کا شہزادہ بن گیا۔ پرستش وُہی رہی۔ خوف وہراس وہی رہے۔ لہُو کی ارزانی وہی رہی۔ انسان ازمنۂ قدیم سے قرونِ وسطےٰ اور قرونِ وسطیٰ سے زمانۂ جدید میں پہنچا۔ لیکن بڑے آدمی سے اُسے نجات نہ ملی۔ وُہ قبیلے داری سے سرمایہ داری اور سرمایہ داری سے جمہوریت کے آغاز کی طرف بڑھا۔ لیکن پیرِ تسمہ پا کی طرح یہ بڑا آدمی ہر وقت اُس کے سر پر سوار رہا۔ میں تمہاری قیادت کروں گا۔ . میں تمہاری رہنمائی کروں گا۔ میرے بغیر تم کچھ نہیں کر سکتے۔ تم طفلِ مکتب ہو۔ تم جاہل ہو۔ نالائق ہو۔ دھوکا کھا جاؤ گے۔ مَیں تمہارا کام کر دوں گا۔ میں تمہارا لیڈر ہوں۔ میرے مشورے پر عمل کرو۔ . . .

اور جب جمہوریت آئی اور انسان کے ذہن میں اجتماعی شعور انگڑائیاں لینے لگا تو شیر نے فوراً اس خطرے کو بھانپا اور پینترا بدل کر کہنے لگا۔ میں تمہارا شیر ہوں کیونکہ تم نے مجھے شیر بنایا ہے۔ تمہارا فیصلہ میرا فیصلہ ہے۔ میں وہی کرتا ہوں جو تم کہتے ہو۔ دراصل شیر میں نہیں ہوں۔ شیر تم ہو۔ میں تو تمہارا مظہر ہوں۔ تم جب چاہو مجھے ہٹا سکتے ہو۔ . . .

لیکن شیر کو کس نے ہٹایا؟ اگر کسی نے ہٹایا بھی تو وُہ خود ایک شیر تھا۔

دوسرا شیر، پہلے شیر سے قوی تر! اور انسانوں نے کہا: "یہ بہت بڑا آدمی ہے۔"
سب اصنام شکستہ ہو چکے۔ لیکن یہ صنم نہیں ٹوٹا۔ ابھی تک صحیح و سلامت ہے شعور و ادراک کی ترقی اور سائنسی کارناموں کے باوجود بڑا آدمی — ایک آدمی۔ — انفرادیت پسند — اقلیت پسند حاکم زندہ ہے اور ہم پر حکومت کر رہا ہے زندگی کے ہر شعبے میں حکومت کر رہا ہے اور مخلوق اپنی اجتماعیت پسندی کے باوجود اُس سے دبی جا رہی ہے۔ پسی جا رہی ہے۔ اپنے لہو کا خراج ادا کر رہی ہے۔ کیونکہ جنگل کا خوف ابھی تک اُس کے ذہن کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

اگر یہ خوف انسان کے دل سے نکل جائے اگر وُہ یہ سمجھ لے کہ بڑا انسان درحقیقت بڑا انسان نہیں ہے۔ اگر جنگل کے سارے جانور اتحاد کر لیں تو بڑے سے بڑا ببر جھک جائے گا اور بھیگی بلی بن کر اتحادیوں کے اشارے پر چلے گا۔ اور اگر وُہ ایسا نہ کر سکے تو خود ہی یہ جنگل چھوڑ دے گا . . . لیکن اجتماعیت پسندی ابھی اس منزل پر نہیں پہنچی۔ ابھی یہ احساس عام نہیں ہوا کہ جب ایک آدمی "بڑا" ہوتا ہے۔ تو ہزاروں چھوٹے چھوٹے آدمیوں سے بڑائی چھن جاتی ہے۔ ورنہ بڑا آدمی جمہوریت پسندوں کا بڑا آدمی بھی یہ کہنے کی جرأت نہ کرتا۔ "تمہیں اس موقعہ پر یہ کرنا چاہیئے۔ یہ نہیں کرنا چاہیئے۔" اُسے فوراً جواب مل جاتا۔ تم کون ہو۔ مجھے بتانے والے، میں خود جانتا ہوں۔ مجھے کیا کرنا ہے۔ اس قوم کا بچّہ بچّہ جانتا ہے۔ اُسے کیا کرنا ہے۔ اس مُلک کا ہر فرد اپنا فرض خوب پہچانتا ہے۔ تم بھی ہماری طرح ایک

آدمی ہو۔ بڑا آدمی بننے کی کوشش نہ کرو۔

لیکن ابھی تک کہیں بھی، کسی ملک میں، کسی قوم میں، یہ ردِ عمل نہیں نظر آتا۔ ہندوستان بے چارے کی تو بات ہی اور ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں بھی جہاں انسانی آبادی نوّے فی صدی تعلیم یافتہ ہے۔ بڑے آدمی پائے جاتے ہیں۔ اُن کی تقاریر ریڈیو پر سنی جاتی ہیں۔ اُن کے پیغام اخباروں میں جلی حروف میں شائع کئے جاتے ہیں لاکھوں آدمی اُن کے اشارے پر کٹ مرنے کو تیار رہتے ہیں۔ اُن کے سگار کا ایک کش۔ اُن کی مونچھ کا ایک بال، اُن کے جوتے کی ایک کیل لاکھوں انسانوں کی زیادہ قیمتی سمجھی جاتی ہے ...... جنگ!

ابھی تک زندگی کے ہر شعبے میں اکثریت پر اقلیت کی حکومت ہے۔ جمہوریت پسند بھی ہر بار یہی کہتے ہیں: "آؤ عوام میں کام کریں۔ عوام کو اپنا ہم خیال بنائیں" ایک بنیادی سوال یہ ہے۔ کیوں عوام میں کام کریں۔ عوام؟ گویا تم خواص میں سے ہو۔ ایک تفریق تو اُسی وقت پیدا ہو گئی۔ جب تم نے دوسروں کو "عوام" کہہ کر اپنے آپ کو بانس پر چڑھا لیا۔ اوہ ... بڑے دیوتا ہیں آپ ... مونٹ ایورسٹ پر بیٹھے ہوئے نیچے "عوام" کو دیکھ رہے ہیں۔ عوام میں کام کریں! گویا عوام اپنا بُرا بھلا نہیں جانتے۔ ہم نے تو یہی سُنا تھا کہ جاہل سے جاہل انسانی گروہ کا فیصلہ فرد کے فیصلے سے بہتر ہوتا ہے۔ پھر تم اپنی رائے اُن پر کیوں ٹھونستے ہو۔ اقلیت کی رائے اکثریت پر، انہیں اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کیوں کرتے ہو۔ تم کیوں نہیں

عوام کے ہم خیال ہو جاتے۔" یہ خیال شروع ہی میں اقلیت ہی اپناتی ہے"۔ اس طرح تو پھر انسان کو شیروں سے کبھی نجات نہ مل سکے گی۔ دنیا کو ہمیشہ بڑے آدمیوں کی ضرورت رہے گی۔ یہی نطشے کہتا تھا۔ یہی آج ویلز کہتا ہے۔ پھر وہ تمہارا عمومی فلسفہ کہاں گیا۔۔۔؟

حقیقت یہ ہے کہ آج تک بڑے آدمیوں نے دُنیا کے لئے کچھ نہیں کیا۔ بُرائی کے سوا، اپنی بڑائی کو بڑھانے کے علاوہ اُن سے کسی دوسرے کام کی توقع رکھنا بے سود ہے۔ بشریت کی فلاح و بہبودی بڑے آدمیوں کے کارناموں میں نہیں۔ چھوٹے چھوٹے آدمیوں کی مشترکہ مساعی میں مضمر ہے۔ ہلاکو سے ہٹلر تک کسی ایک "فاتح اعظم" کی ذاتی خصوصیات پر غور کیجئے۔ ان کی سرشت میں خود پرستی، خودستائی اور انسانی زندگی کی تحقیر کو اتنا دخل ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ لاکھوں انسان ان کی کیوں پرستش کرتے ہیں۔ یہ لوگ اگر ان کی پرستش کرنے اور اُن کے لئے لڑنے مرنے کے بجائے الگ ہو کر ایک طرف بیٹھ جائیں اور ان بڑے لوگوں کو میدانِ کارزار میں اکیلا چھوڑ دیں تو انسان کی صعوبتیں ایک ہی دن میں ختم ہو جائیں۔

کہا جاتا ہے کہ ہلاکو اور ہٹلر کے علاوہ دُنیا میں ایسے بڑے آدمی بھی ہیں جنہوں نے انسانی برتری اور بہبودی کے لئے واقعی کام کیا ہے۔ مثلاً مفکر،

فلسفی، مصلح، ادیب، سائنس دان، لیکن میں تو انہیں بھی بڑا آدمی سمجھنے سے انکار کرتا ہوں۔ ان میں بہت سے ایسے بڑے آدمی ہیں جنہوں نے اپنے فلسفے میں، ادب میں، سائنس کی ایجادات میں انسانی تخریب کے پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی امکانی کوشش کی ہے۔ جنہوں نے "شیروں" کے فلسفے کو سراہا ہے اور اُسی قسم کے ادب کی تخلیق کی ہے اور اُسی قسم کے ہتھیار بنائے ہیں جو شیروں کی حکومت کو انسانی آبادی پر زیادہ سے زیادہ عرصے تک قائم رکھ سکیں جو چند ایسے بڑے آدمی باقی رہ گئے ہیں جو اس فہرست سے خارج ہیں۔ اُن کے تعمیری کارناموں میں بھی اُن ہزاروں چھوٹے چھوٹے آدمیوں کے علمی۔ ادبی۔ سائنسی تجربات کو دخل ہے کہ جن کی مشترکہ کاوشوں سے انسانی علم و فن کے خزینے بھرے گئے ہیں۔ پھر ہم تاج محل پر آخری اینٹ لگانے والے کو تاج محل کا خالق کیوں سمجھیں ہیملٹ کے کردار کے لئے شیکسپیئر کو کیوں سراہیں کشش ثقل کے اصولوں کا خدا نیوٹن کو کیوں ٹھہرائیں؟ اگر گاندھی جی نہ ہوتے تو کیا ہندوستان میں آزادی کی تحریک نمودار نہ ہوتی؟ اگر جناح صاحب نہ ہوتے تو کیا مسلمان پاکستان کا مطالبہ نہ کرتے! اور پھر جہاں ایک لیڈر کا پسینہ گرتا ہے۔ وہاں ایک سو رضاکاروں کا لہو نہیں بہتا ہے؟ جب تک ریلوے انجن بنتا ہے۔ تو کیا لوہے کو پگھلانے سے لے کر لوہے پر روغن کرنے تک تمام سائنسی عملے حرکت میں نہیں آتے؟ جب ایک افسانہ لکھا جاتا ہے تو حروفِ ابجد سے لے کر اُن تمام نرم و نازک خیالات کے

تانے بانے سامنے نہیں ہوتے۔ جن کے رنگین نقوش اُن سینکڑوں بلکہ ہزاروں مصنفین کے مُوقلم نے اُگلے ہیں کہ جن کے نام سے بھی کوئی آگاہ نہیں؟ جب ایک نیا فلسفہ مرتّب کیا جاتا ہے تو اُس کی ترتیب د تواتر میں وُہ اَن گنت جزویات اور کڑیاں نہیں ہوتیں جو ایک نہیں سینکڑوں فلسفیوں نے شب و روز کی جانکاہ کاوشوں کے بعد تعمیر کی ہیں؟ پھر ان تمام چیزوں کا خالق ایک آدمی کیسے ہو سکتا ہے اور خاص طور پہ وُہ "بڑا آدمی" جو اپنے آپ کو یوں مُنتشر کرتا پھرتا ہے۔ میں خالق ہوں اس فلسفے کا، اس ادب کا، اس سائنس کا، اس ایجاد کا، میں شیر ہوں۔ میں بڑا آدمی ہوں! کیوں ہم اس آدمی کی پرستش کریں۔ اسے جُوتے کیوں نہ لگائیں؟

اگر آپ کسی عام آدمی، کسی انگریز، جرمن، ہندوستانی، فرانسیسی، چینی، امریکن، حبشی، کسی مُلک یا کسی قوم کے ایک آدمی سے بات کریں۔ مگر شرط یہ ہے کہ وُہ ایک عام آدمی ہو۔ بڑا آدمی نہ ہو تو آپ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔ کہ وُہ کتنا اچھا آدمی ہے۔ اُس کا دل مہر و محبت کا سرچشمہ ہے۔ وُہ اپنے ہمسایوں سے محبت کرتا ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہتا کہ اُسے اُس کے گھر میں، اُس کے چھوٹے سے باغیچے میں، اُس کے کھیتوں میں کام کرنے کا موقع دیا جائے۔ وُہ اپنے دوستوں اور اپنے کام کرنے والے ساتھیوں کے درمیان ہنستے کھیلتے

اپنی زندگی بسر کرنی چاہتا ہے۔ وُہ بڑا انسان نہیں ہے۔ کیونکہ وُہ بڑا انسان نہیں ہے۔ وُہ دوسروں کے حقوق غصب کرنا نہیں چاہتا۔ دوسروں کی آزادی چھیننا نہیں چاہتا۔ صرف اپنے حقوق، اپنی آزادی چاہتا ہے۔ یہ فتنہ تو صرف بڑے آدمیوں اور اُن کی جماعتوں نے جگا رکھا ہے۔ یہ لوگ اقلیت میں ہیں اور انسانوں کے حقوق پر چھاپہ مارے بیٹھے ہیں۔ جب تک یہ لوگ موجود رہیں گے۔ ہمیں کبھی چین سے بیٹھنے نہیں دیں گے اور ہر بیسویں سال نئی انسانی نسل کو ذبح کرتے رہیں گے۔ ان سے کسی بہتری کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی۔ ہماری ترقی بڑے آدمیوں کی حد سے بڑھی ہوئی خود پرستی، ہوس اور پندار جاہ وحشم سے نہ ہوگی بلکہ چھوٹے چھوٹے آدمیوں کی مشترکہ مساعی سے ہوگی۔ نئی دُنیا بڑے آدمیوں کی ضرورت نہیں۔ اچھے آدمیوں کی ضرورت ہے!

دیکھئے، دیکھئے۔ وُہ رہا ایک "بڑا آدمی"۔۔ شیر آیا، شیر آیا، دوڑنا۔۔۔!

ناپختہ

(ایک کہانی اور ایک صوتی تجربہ)

چل چھنگاچی روچو لاڑے دے پاڑے۔ حی گاں رِگ رو پو گیرتی دیواریں لاکڑاپچھے مائی چودراتن بلبل ہندوستان، شریمتی گلنار فوفپی کنگ واہیات ستیاناس بکواس فلفل دراز اللہ ہو شافی حکیم اجمل خان خانان ابوالکلام آزاد ماہم داور، دوآؤٹ کرکٹ کلب آف انڈیا ریڈیو فنگ فنگ ناچے، کرکی بازار بیرہ بھیتر دروازہ بند کر کے بیٹھ گیا کہ شام نے پکارا۔ ابے حسین کدھر بھاگ گیا تھا؟

"جی میں ۔ ۔ ۔" حسین رولا

"ہاں ہاں۔ میں تم سے بسا کتا ہوں۔ روتا کیوں نہیں۔ چپ کیوں کھڑا ہے"

"جی روتا ہوں"

سدل پھر!

جی میں ذرا باہر چلا گیا تھا۔ میرے ماموں جان آئے ہوئے تھے اور پھر مجھے کل بھی آدھے دن کی چھٹی چاہئے۔ خورشید باجی . . . !

خورشید باجی کے سالے!

دیکھئے صاب۔ گالی نہ دیجئے اور سب کچھ کہہ لیجئے۔ پر اُسے گالی نہ دیجئے آپ مجھے ہر طرح کی گالی دے سکتے ہیں۔ لیکن خورشید باجی کو کچھ نہیں کہہ سکتے

کھڑا رہا

حسین کھڑا ہو گیا

ڈنڑ پیل

وُہ ڈنڑ پیلنے لگا۔

تیواری کے دماغ میں مکھیاں گھسنے لگیں۔ وُہ بھنبھنا کر اُس سے کہنے لگیں۔ ہم غریب ہیں۔ یہ ہمیں اپنے مکان میں گھسنے تک نہیں دیتا۔ اس کا ذکر غریب ہے۔ یہ اُس پر ظلم کرتا ہے۔ تیواری نے سوچا۔ مکھیاں ٹھیک ہی تو کہتی ہیں۔ یہ شام سالا، بھنگی سالا مجے کرتا ہے۔ اس طاق میں آفتاب رکھ دے ساقی! گویا کی نزاکت کی دیوی خراماں خراماں من مندر میں ڈبس آئی تھی۔ پجارن نے

دروازہ کھول دیا تھا اور پٹ توڑ دیئے تھے۔ کھورسید باتی کی ماں! لیکن یہ تو سوچیئے کہ فتراں جی اوہتی اُو فل لاا وڑا دا تخیل داں ہندوستاں مسلماں ٹھی ہراں فاں ایل لاکرفاں! رفل تو کریکل جنبشِ مژگاں!

شیام نے ایک سگریٹ حسین کے منہ میں دیا۔ "پی۔ علیش کرا ور بتا تجھے خورشید باتی سے عشق کیسے ہوا؟"

"جی، ان دنوں میں بہت کم عمر تھا" حسین سگریٹ گسُملا کر روُلا۔ "وہ ہمارے قصبے میں رہتی تھی اور میرے باپ نے مجھے آگے پڑھانے سے انکار کر دیا تھا اس لئے میں بیکار اوجا اوجا پھرتا تھا۔ ایک دن مجھے کھورسید باتی کی ماں مل گئی۔ کہنے لگی۔ تو ہمارے ہاں نوکری کر لے۔ بیں نے منجور کرلیا۔ تو جی میں وہاں نوکر لوگرا۔ اُن دنوں کھورسید باتی دسویں میں۔ نہیں نویں میں۔ نہیں دسویں میں پڑھتی تھی۔ شام کو جب میں اُس کا کمرہ صاف کرنے جاتا تو وہ مجھ سے بہت سے ادھر اُدھر کی باتیں کرتی۔

"کیا باتیں کرتی تھی وہ"۔ شام نے للچاتے ہوتے لہجے میں پوچھا

"جی کچھ نہیں . . . !"

"سالا!"

"جی، بتاتا ہوں۔ حسین جلدی سے روُلا ــــ وہ مجھے ــــ وہ میری رانوں پہ چٹکیاں لیا کرتی تھی:

"اوخاں . . . اوبھئیں . . ." شام چارپائی پر اک شیریں اذیت سے بیتاب ہوکر لوٹنے لگا۔ پھر پوچھنے لگا . . ." اور تو؟"

"میں؟ جی . . . میں؟ ہی ہی ہی . . . میں چُپ ہو رہتا جی۔ بہت کم عمر تھا نا جی، پر مجھے وُہ بڑی اچھی لگتی تھی، پھر وُہ اپنی بڑی بہن کے ساتھ سورت چلی گئی۔"

"ارے" شام نے کہا

"بھنگی!" تیواری نے کہا

"پر میں بھی اُس کے ساتھ سورت چلی گئی" حسین رولا "کیونکہ جی خدا نے جہاں بنایا ورکا ای جہان ڈابے، بردی زبان گمگم۔ ذراں مجاق کھابے!

شیام بولا۔ "پھر کیا ہوا؟"

"پھر یہ ہوا جی" حسین رولا "اُس کی بڑی بہن جو سورت بیاہی ہوئی تھی۔ مجھے ہر روز پیٹنے لگی۔ کیونکہ وُہ چاہتی تھی کہ میں اُس کے سنگ رہوں۔ پر میں نہ مانتا تھا۔ میں تو کھورسید بائی۔ ہی ہی ہی"

"دانت کیوں نکالتے ہو؟" شیام غنگنھارا

حسین جھجک کر مسکنایا "جی نہیں۔ جی بہت اچھا" اُس کی آواز میں بلائین خرخراہٹ ڈرپوکی مرناہٹ اُنگا۔

پر وہ پھر بھی مسکراتا رہا۔ رولا "تو حضور تنگ آکر میں نے وُہ نوکری ابرار

کردی۔"

"ابرار کردی؟ تو پھر تیرے کھانے پینے کا کیا بندوبست ہوتا ہوگا؟" تیواری نے پوچھا۔

"کھورسید بائی نے مجھ کو دس روپے دیئے۔ پہلے میں ہوٹل میں کھانا کھاتا تھا۔ پھر میں اُسی ہوٹل میں نوکر ہوگیا۔ ہم کبھی یہاں کبھی وہاں ملتے تھے۔"

یہ رولتے ہوئے حسین کے لبوں پر اک ہلکی سی تمتن آگئی۔ شام نے کہا۔ "اچھا؟ .... پھر؟"

"جی پھر کھورسید بائی وہاں سے احمدآباد چلی گئی۔ میں نے بھی ہوٹل کی نوکری اڑبگینج کردی اور احمدآباد کو سپارڑ ہوگیا۔ جب میں احمدآباد سلفلایا۔ اُس وقت میری جیب میں صرف پنج آنے تھے۔ پرپنج آنوں سے کیڑا چوٹا؟ میں اسی طرح نوکری کی تلاش میں بھاگم بھاگ الفتوایا رہا۔ لیکن کہیں نوکری نہ ملی۔ اور نہ ہی کھورسید بائی کی صورت نظر آئی۔ ایک دن میں ایک کوئلے کی دکان پر کھڑا تھا۔ اچانک نظر جو اُوپر گئی۔ تو کیا دیکھتا ہوں کہ سہ منزل پر وہ محبوب طرازی اعلٰے گاردی فرگراج ہے۔ اُس نے مجھے ہات سے اندر آنے کا فلارہ جیا اور میں جھٹ سے اندر ڈبسا اور سیڑھیوں کے اوپر چلتا گیا۔

وہ اپنے کمرے میں اکیلی تھی۔ اُس کی بھابی کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ میں اُسے

دیکھ کر رونے لگا۔

سالا!

بھنگی!

"کھورسید بائی نے پھر مجھے پندرہ بیس روپے دیئے اور کہا کہ میں کسی ہوٹل میں نوکری کر لوں اور اس سے ملتا رہوں۔ مگر صاب میں نے وہ پندرہ روپے پانچ دنوں میں سب فراٹ کر دیئے۔ کیونکہ زرخرادی کی تمنا میرے دل میں ہے۔ بلبل چو رنگ بادی جنگل میں ہے فلسائے؟"

"فلسائے!" شیام نے کہا: "مگر یہ بتاؤ آگے کیا ہوا؟"

حسین نے کہا "جی، پہلے میری ایک بات کا جواب دیجئے۔ مجھے کل آدھے دن کی چھٹی...."

"منظور" شام رولا

"اور پانچ روپے بھی۔ میں نے ہوٹل والے کا بل...."

"منظور۔ آگے چلو"

"ذرا آج کا حساب دیکھ لیجئے"

"صبح دیکھیں گے پر اب جاگے فلو"

حسین جاگے فلکر بہنے لگا "تو صاب میں وہاں پورے دو ماہ رہا۔ احمد آباد میں، اور کھورسید بائی نے میرے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ میں زندگی بھر اس کے

سلوک کو یاد رکھوں گا۔ ہائے ایسی خوبصورت پارسن میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ وُہ ان دنوں دسویں میں — نہیں نویں میں — نہیں دسویں میں پڑھتی تھی، اور...

"ہاں، ہاں۔ پھر کیا ہوا؟"

پھر چھٹیاں ختم ہو گئیں اور وُہ ہمارے قصبے میں واپس چلی آئی۔ لیکن میں نے واپس آتے ہوئے اُس سے کہا۔ میں اپنے گھر اس طرح نہیں جا سکتا۔ میرا باپ کہے گا کہ جگرا آوارہ پھرتا رہا ہے۔ مُلے سچ لگام نہیں کیا۔"

"فنے! فنے!" شیام نے کہا

"تو صاب اُس نے مجھے پچیس روپے اور دیئے اور وُہ رُپے میں نے گھر جا کر بڑے ٹھاٹ سے اپنے باوا کے حوالے کئے۔ میرے ماں باپ بے حد دستباز ہوئے کہ بیٹے نے سچ لگام کیا۔ اسی لئے تو وُہ اتنی پیگار گھر لایا ہے۔ ولقد مکرر ارشاد ہو۔ او تخیل جراثیم الفتح ہو فانی دارا شوزمبک آغا ای مُن آں مُسلماں ہندو خسادمہلر!

تیواری بولا: "بھنگی سالا جھوٹ سلگتا ہے۔ ایک بات بھی سچ نہیں۔ سب چھٹی لینے کے بہانے ہیں۔ بڑا اکروٹا جگیرا ہے۔ آں۔ ای۔ او مشٹر تیواڑی۔ آئی ٹولڈ یو تو سنڈ فارمی گھی بٹ یو ڈڈ نٹ مشٹر تیواڑی! ای نزاکت کی دیوی!

شیام مُسکرایا۔ فنے فنے مکرا اُٹھ جاؤ۔ کمینے ذرا بات تو سُن لینے دو۔

حسین نے کہا۔ "جی نہیں۔ کوئی بات نہیں ہے اب تو۔" وُہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

شیام نے چنگھاڑ کر کہا "بیٹھ جاؤ"
حسین بیٹھ گیا اور اپنا گر لبیرا لیا
"اگر کیوں لبیرائے بیٹھے ہو؟" شیام نے غصّے میں آکر کہا
حسین نے سر اُونچا کر لیا
شیام نے بڑ فینز سرابی مجکل ہو کر کہا "اچھا اب آگے کہو۔ ہم تمہیں اب کچھ نہیں کہیں گے"
حسین بولا "تو صاب میں پھر اپنے قصبے میں رہنے لگا۔ دل میں سوچتا تھا اب کھورسید بائی کے ہاں نوکری نہیں کروں گا تو بڑی مسکل ہو گی۔ میں اس کے پاس کیونکر جاؤں گا۔ اُس کی صُورت کیسے دیکھوں گا۔ ایک دن مجھ کو اُس کی ماں ملی۔۔
"کون؟"
"جی کھورسید بائی کی ماں"۔ اور یہ کہتے ہُوئے حسین کے لبوں پہ اک ہلکی سی مُسکن آگئی۔" اور وہ بولی۔ تم ڈکرا امرے آں کیوں نہیں اٹکل پچی کرتا ہے۔ میں نے کہا۔ میں اٹکل پچی کروں گا۔ اُس نے کہا۔ تو پھر آجاؤ۔ تو جی میں پھر اُسی دن سے اُن کے گھر میں اٹکل پچی کرنے لگا۔
"ننھے! اُفنے!" شیام رو لا
"اوں ہوں مسٹر یُو ڈَونٹ! تیوراری اُمنایا

حسین بولا "بلساند یہ ہُوا جی کہ ایک رات کھورسید بانی مجھے جگا کر کہنے لگی۔ مجھے باتھ روم جانا ہے"۔

میں نے آنکھیں مَلتے ہُوئے کہا "تو جاؤ جی۔ مجھے کیوں حیران کرتی ہو"

وُہ بولی "مجھے اندھیرے میں ہندروغ لگتا ہے"۔

میں نے کہا "بجلی کی بتی جلا لو"۔

وُہ بولی "نہیں تم میرے ساتھ چلو"۔

چنانچہ میں باہر بیٹھ گیا جی۔ اور وہ اندر باتھ روم میں چلی گئی۔

"پھر؟" شیام نے تیزی سے کہا

"پھر یہ ہُوا جی کہ میں وہیں باتھ روم کے باہر سو گیا

"ابے!" شیام چیخا

"سالے۔ بھنگی!" تیواری کی آنکھوں سے آگ برسنے لگی

میں وہیں سو گیا۔ یکایک میرے کانوں میں اک چیخ آواز آئی۔ وُہ میرے گلے سے لپٹ گئی تھی۔

"اوفناک!" شیام دُلایا

"اُس طاق میں آفتاب رکھ دے ساقی!" تیواری نے ایک آنکھ بند کر کے بسا حسین جاگے فلک تمسرا! تو صاب میری تو نیند اکھڑ گئی۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ کھورسید کیا بات ہے۔ وُہ بولی۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ اتنے میں چیخ کی آواز

سُن کر اُس کی ماں دوڑی دوڑی آئی اور کھورسید کو مجھ سے لپٹا ہوا دیکھ کر مجھے پیٹنے لگی۔ ڈنڈے مار مار کر اُس نے مجھے گھر سے باہر نکال دیا . . . .

حسین کے سینے سے ایک آہ اُٹھی اور اُس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

کھورسید بائی مجھ سے بڑی محبت کرتی تھی۔ پر جب اُس کی ماں ہی نے مجھے گھر سے باہر نکال دیا۔ پھر وہ غریب کیا کرتی۔ مجبور ہو کر اُس نے ایک اور لونڈے سے عشق کر لیا۔ اُس کا نام عمر تھا۔ میں کھورسید کے خط عمر کے پاس لے جایا کرتا تھا۔ میں نے کھورسید سے ایک دن کہا۔ دیکھو مجھے یہ بات پسند نہیں ہے وہ بولی۔ عمر تو سمجھو میرا بھائی ہے۔ بس اوفلین نہ پوٹے۔ تمی بلا وا اور کون سپوٹے؟

میں نے کہا " اگر یہ بات ہے۔ تب ٹھیک ہے"

تو صاب میں بہت دنوں تک عمر کے خط اور کھورسید بائی کے خط اُن دونوں کو پہنچاتا رہا۔ پھر عمر بمبئی میں پڑھنے کے لئے چلا گیا اور اب سُنا ہے کہ کھورسید بائی بھی بمبئی میں ہے۔ عمر مجھے ایک بار بمبئی میں ریس پر ملا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا تھا۔

"تو تم اب کیا چاہتے ہو؟" شام نے افسردگی سے کہا

"جی میں کچھ نہیں چاہتا۔ میں تو نوکر پیشہ ہوں۔ میں کیا چاہ سکتا ہوں۔ ہاں اگر میں بھی عمر کی طرح کالج میں پڑھتا تو ایک دفعہ تو فنگ فنگار کر دیتا۔ لیکن افسوس تو یہی ہے کہ اینجا نوبت رسید، کسب کمال کُن کہ عزیز جہاں شوی

برفتاک آفتاب میں لگادی کرن پاپوش مطلائے کی۔"

"جاگے فلو" شیام رولا

حسین بولا۔" کل رات کو وُہ مجھے خواب میں ملی تھی۔ میری رُوح کا ذرہ ذرہ اُس پر قربان ہے۔ میں نوکر آپ کا ہوں۔ لیکن غلام کھورسیدہ کا ہوں۔ اگر میں غریب نہ ہوتا . . . "

حسین رونے لگا۔

"تم کھورسید بائی کی نوکری کرو گے؟" تیواری نے پُوچھا

"جی، کیوں نہیں۔ اب بھی اگر وُہ بلائے۔ میں فوراً چلا جاؤں گا۔"

"بھنگی سالا" تیواری بولا۔

"جی مجھے گالی نہ دیجئے اور جو جی چاہے کہہ لیجئے۔ لیکن مجھے گالی نہ دیجئے۔"

"ونٹر پیلو" شیام نے کہا "بدمعاش"

حسین ڈنٹر پیلنے لگا۔

شیام سوچنے لگا۔ یہ امتیاز امیر و غریب، پر —— محبت میں دولت کی دیواریں اگر حسین اُج میگ ہوتا۔ تو وُہ آج کھورسید تو کیا کھورسید بائی کی ماں سے بھی شادی کر لیتا۔ لیکن اب . . . کیا! . . . بلکہ ادب میں زندگی روا ہے تو زندگی میں محبت روا کیوں نہیں؟ کیا اُسے یہ حق نہیں کہ وُہ بھی کھائے سہائے اور پی کر فلنٹوش ہو جائے؟

اُس نے حسین کو جیب سے پانچ روپے نکال کر دیئے اور پھر خود کروٹ بدل کر سو گیا۔

دوسرے دن اُس کا بٹوا خالی تھا اور حسین روپے لے کر کہیں فرار ہو گیا تھا غالباً کھدر سید بائی کو ماہم میں کہیں ڈھونڈ رہا تھا۔ شیام اُس دن بھوکا بھی رہا۔ زندگی میں پہلی بار اُسے اس طرح بھوکا رہنا پڑا۔ لیکن پھر بھی اُسے اپنے مفرور نوکر کو گالی دینے کی ہمت نہ ہوئی۔ یکایک اُسے احساس ہوا کہ اگر سب انسان تیر پتر مان ہوتے تو یہ دُنیا قضا و قدر کے نمونے جے برٹ اینڈ کمپنی بلاک میکر سالانہ کا غذ بدرنگ ہوتی۔ لیکن مصیبت تو یہی ہے کہ ابھی انسان کے دل میں وُہ شعور پیدا ہی نہیں ہُوا۔ اور... اسی طرح اندھا تباہی کے غار میں چلا جا رہا ہے۔ زینہار کہ تُو جا منڈا گ ری تا لے، جائیں تو کہاں جائیں ہم بھوک نگر والے؟

محمد اقبال عباسی خوشنویس لاہور

(لاہور آرٹ پریس انار کلی بالمقابل گنپت روڈ لاہور میں چھپا)